ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

اسلام میں حیثیت نسواں
— سید جلال الدین عمری —

تفسیر قرآن اور غلام احمد پرویز
— ڈاکٹر محمد شہباز منج —

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری
— مولانا یحییٰ نعمانی —

عصری تہذیب
اور بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت
— ڈاکٹر محمد اکرم ورک —

تعارف وتبصرہ
— ایران کی چند اہم تفسیریں —
— قطع حیات بہ جذبۂ رحم —
— تاریخ افغانستان وشیشان —
— آزاد ہندوستان میں عربی ادب —

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۱۱ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93, ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۰ شمارہ:۱

محرم ——— ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۱۱ء

تحقیقاتِ اسلامی کے قدیم شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09760248489

ای میل : tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09412562972

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

اسلام میں حیثیتِ نسواں — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

تفسیر قرآن میں غلام احمد پرویز پر مستشرقین کے اثرات — ڈاکٹر محمد شہباز منج — ۲۳

بحث ونظر

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری- ذمّی — مولانا یحییٰ نعمانی — ۵۳

عصری تہذیبی کش مکش میں بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے — ڈاکٹر محمد اکرم ورک — ۸۱

تعارف وتبصرہ

ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں (جلد سوم) — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۷

فیضانِ رسالت — ،، ،، — ۱۰۸

قطعِ حیات بہ جذبۂ رحم کی شرعی حیثیت — ،، ،، — ۱۰۹

انتہا پسندی اور اس کا تدارک — مولانا جاوید احسن فلاحی — ۱۱۰

مدارسِ اسلامیہ کی دینی ودعوتی خدمات — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۲

تاریخ افغانستان وشیشان (چیچنیا) — ،، ،، — ۱۱۳

مجلّہ 'الأخبار' بھٹکل -فلسطین نمبر — ،، ،، — ۱۱۴

آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۷

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۳۸) — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر محمد شہباز منج
لیکچرر شعبۂ اسلامیات، یونی ورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا (پاکستان)

۲۔ مولانا یحییٰ نعمانی
مرتب ماہ نامہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنؤ

۳۔ ڈاکٹر محمد اکرم ورک
شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، گوجرانوالہ (پاکستان)

۴۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۵۔ مولانا جاوید احسن فلاحی
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنّی)، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۶۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

حرف آغاز

اسلام میں حیثیتِ نسواں
چند اساسی تصورات

——————— سید جلال الدین عمری

مدیر محترم مولانا سید جلال الدین عمری کی تصنیف 'عورت - اسلامی معاشرہ میں' کو ہندو پاک کے علمی و دینی حلقوں میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اس کی تالیف کو نصف صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ اپنے موضوع پر بھرپور، مدلل اور بے مثال کتاب ہے۔ مصنف کو اب تک اس پر نظرثانی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب انھوں نے نظرثانی کی تو اس میں جا بہ جا اضافے کیے۔ یہاں اضافہ شدہ مباحث کے چند منتخب حصوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ ان سے صحیح طور پر فائدہ کتاب کے اضافہ شدہ ایڈیشن کے مطالعہ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (معاون مدیر)

عہدِ جاہلیت میں عورت کی بے قدری

سرزمینِ عرب پر اسلام کی آمد سے قبل ظلمت کے جو بادل چھائے ہوئے تھے اس میں بعض اوقات لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ کبھی تو ماں، جس کا سینہ مہر و محبت کا سرچشمہ ہوتا ہے، وضعِ حمل کے بعد جب دیکھتی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اسے موت کے آغوش میں پہنچا دیتی۔ بعض اوقات لڑکی چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی، اس کا باپ گڑھا کھود کر اس میں اسے پھینک دیتا اور مٹی سے پاٹ دیتا۔ جو معصوم جان اس درندگی سے بچ جاتی اسے بھیڑ کے اون سے بنا ہوا کپڑا پہنا کر اونٹ اور بکریاں چرانے میں لگا دیتے۔[1]

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء، ۴/۶۹۴

قیس بن عاصمؓ نے دورِ جاہلیت میں آٹھ لڑکیاں اور ایک روایت کے مطابق بارہ تیرہ لڑکیاں زندہ دفن کی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کے بدلے اتنے ہی غلام آزاد کردو۔ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا سرمایہ اونٹ تھے۔ آپ کے حکم سے انھوں نے اتنے اونٹ ذبح کیے اور صدقہ کیا۔[۱] (ہوسکتا ہے دونوں باتوں پر عمل کیا ہو)۔

اس ظلم کا بعض لوگوں کو احساس تھا۔ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ لوگوں کو اس ظلم و بربریت سے منع کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے ترسٹھ (۶۳) (ایک روایت میں ہے کہ تین سو ساٹھ (۳۶۰)۔ ہوسکتا ہے اس میں مبالغہ ہو) لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے، ہر ایک کو دس ماہ کی دوگابھن اونٹنیوں اور ایک اونٹ کے عوض حاصل کرتا تھا۔ کیا اس کا اجر مجھے ملے گا؟ آپ نے فرمایا: یہ تمھارا حسن سلوک ہے۔ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسلام کی نعمت سے نوازا ہے۔[۲]

یہ وحشیانہ حرکت انسان کی فطرت کے خلاف ہے، اس لیے اس طرح کی اور بھی انفرادی کوششیں شاید ہوتی رہی ہوں۔ اس سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ عرب میں قتل بنات عام تھا۔ اس سے ان کا وجود ہی آہستہ آہستہ ختم ہوجاتا۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے واقعات شاذونادر نہ تھے، بلکہ بہ کثرت ہوتے رہتے تھے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ قبیلہ ربیعہ اور مضر میں ایسے لوگ تھے جو لڑکیوں کو دفن کرتے تھے (کبھی) دو آدمیوں کے درمیان بات طے ہوتی تھی کہ وہ ایک لڑکی کو باقی رکھے گا اور دوسری کو ختم کردے گا۔ بغوی کہتے ہیں کہ اس کا رواج قبیلہ ربیعہ اور مضر اور بعض عربوں میں تھا، قبیلہ کنانہ میں اس پر عمل نہیں ہوتا تھا۔[۳] قبیلہ کندہ کا بھی اس سلسلے میں ذکر آتا ہے،

---

۱ ابن الاثیر، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء، ۴/۴۱۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دار الحدیث القاہرۃ، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ۸/۳۰۴

۲ ابن الاثیر، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ۳/۲۲، ۲۳۔ زمخشری، الکشاف مع حاشیۃ الشیخ محمد علیان، ۴/۷۹۵

۳ خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، مع معالم التنزیل، البغوی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء، ۲/۴۵۳

لیکن یہ کوئی عام روش نہ تھی۔ قاضی ابومحمد کہتے ہیں:

کان جمهور العرب لا یفعله۔[۱] عام عرب یہ نہیں کرتے تھے۔

اسلام نے عورت کو حقِ حیات عطا کیا

اسلام نے شروع ہی سے 'قتل اولاد' کو ایک اہم ایشو بنایا اور اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کے نزدیک کسی ایک بے گناہ کا قتل نوعِ انسانی کا قتل ہے۔ اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ انسان اپنی معصوم اولاد اور جگر گوشوں کو قتل کردے۔ اس دنیا میں ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے حقِ زیست لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسے لازماً یہ حق ملنا چاہیے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ ماں باپ کا دست شفقت جلّاد کا ہاتھ ثابت ہو، وہ اپنے جگر گوشوں کا حقِ حیات سلب کرلیں اور انھیں موت کی نیند سلا دیں۔

قتل اولاد کے محرکات

قتل اولاد کے مختلف محرکات تھے۔ بڑا محرک تو غربت وافلاس یا اس کا اندیشہ تھا۔ خاص لڑکیوں کو ختم کرنے کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔

قبائل عرب کے درمیان جنگ عام تھی۔ کسی بھی وقت کوئی قبیلہ دوسرے پر حملہ کردیتا۔ وہ سوچتے تھے کہ عورتیں اپنا دفاع نہیں کرسکتیں، وہ آسانی سے گرفتار ہوجائیں گی اور باندی بنالی جائیں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ ان کا وجود نہ رہے۔

یہ غلط عقیدہ بھی ان میں تھا کہ فرشتے، اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر ہم اپنی لڑکیوں کو ختم کریں گے تو وہ ان ہی سے مل جائیں گی۔ اس لیے یہ کوئی غلط عمل نہیں ہے۔

وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے کہ ان کی لڑکی دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کے نکاح میں جائے اور ان پر اس قبیلہ کی برتری قائم ہوجائے۔

لڑکوں کے سلسلے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ کبھی ایک شخص نذر مان لیتا کہ اگر مجھے اتنے لڑکے ہوں گے تو ایک لڑکے کو قربان کردوں گا۔ مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ

---

[۱] ابن عطیۃ الاندلسی، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، ۳/۴۷۴، طبع دولۃ قطر

کے جدامجد عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس لڑکے ہوں گے اور وہ ان کی دفاع اور حمایت کے قابل ہو جائیں گے تو ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں کعبہ کے پاس قربان کر دیں گے۔ جب سب بچے اس عمر کو پہنچے تو انھوں نے اپنی نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ بچے بھی تیار ہو گئے۔ اس کے لیے قرعہ اندازی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب نے ان کی قربانی کا ارادہ کیا تو قریش نے منت سماجت کی کہ وہ اس اقدام سے باز آ جائیں۔ پھر ایک کاہن کے مشورے سے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کیے اور عبداللہ کی قربانی کے ارادے سے باز رہے۔[۱]

قرآن نے محرّکاتِ قتل کی تردید کی

اس طرح قتل اولاد کے پیچھے مختلف سماجی، معاشی اور مذہبی محرکات تھے۔ قرآن مجید نے اس کے ایک ایک پہلو پر تنقید کی، ان کے اوہام و خرافات کی تردید کی اور ان کی نامعقولیت واضح کی، غلط تصورات کی اصلاح کی اور صحیح تصور پیش کیا۔

مشرکین عرب کے فکر و عمل پر شرک کا جس طرح غلبہ تھا اس کا سورۂ انعام میں تفصیل سے ذکر ہے۔ اسی سلسلے میں فرمایا کہ وہ اپنی کھیتی باڑی اور مویشی میں ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے مزعومہ خدا کے شریکوں کا رکھتے ہیں۔ ان کے یہ شریک انھیں اتنے عزیز ہیں یا ان پر ان کا اتنا خوف طاری ہے کہ اللہ کا حصہ تو ان شریکوں کے حصے میں چلا جاتا ہے، لیکن شریکوں کا جو حصہ ہے وہ اللہ کے حصہ میں کبھی شامل نہیں ہو پاتا۔ اس کے بعد فرمایا:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ۔ (الانعام:۱۳۷)

اسی طرح بہت سے مشرکین کو خدا کے ساتھ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے ان کی اولاد کے قتل کو آراستہ کر دیا ہے، تاکہ ان کو ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان کے لیے خلط ملط کر دیں۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتے۔ چھوڑو ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو۔

۱۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل ابن ہشام کی السیرۃ النبویۃ، داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء، ۱/۱۸۸، ۱۸۹ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ، ۴/۴۱۲، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۸/۳۰۴

آیت میں 'کثیر من المشرکین' (بہت سے مشرکین) کے الفاظ آئے ہیں۔اس سے مراد وہ مشرکین ہیں جو قتلِ اولاد کا ارتکاب کر رہے تھے۔ان کی ایک بڑی تعداد تھی۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عرب کی اکثریت اس میں ملوّث تھی۔[۱]

آیت سے قتل اولاد سے متعلق بعض باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- مشرکین نے خدا کا جن کو شریک قرار دے رکھا تھا انھوں نے قتل اولاد کو ان کے لیے مزین کر دیا تھا۔ایک غلط اور بھیانک عمل کو اس طرح آراستہ کر دیا تھا کہ وہ اس کی قباحت اور سنگینی کو محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات وہ اسے ایک پسندیدہ فعل سمجھتے تھے۔

۲- شرکاء سے مراد کون ہیں؟ یہ وہ شیاطین ہیں جو غلط اور فاسد خیالات ذہنوں میں ڈالتے رہتے ہیں اور انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو اپنا لیتا ہے۔اس میں وہ مذہبی راہ نما، پروہت اور پادری بھی ہیں جو کسی غلط کام کو مذہبی رنگ دیتے ہیں اور ان کے معتقدین اسے مذہبی عمل سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں۔ان میں گم راہ لیڈر اور رہ نما بھی آتے ہیں جو مختلف حکمتیں بتا کر قتلِ اولاد کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس میں شامل ہیں۔

۳- تیسری بات یہ کہی گئی لِيُرْدُوهُمْ (تاکہ انھیں ہلاک کر دیں) اس کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کی گئی کہ قتل اولاد ہلاکت اور تباہی کا راستہ ہے۔جو فرد یہ راہ اختیار کرتا ہے وہ نسل کشی کا ارتکاب کرتا اور اپنے ہی دست و بازو قطع کرتا ہے۔ جو قوم اس پر عمل کرتی ہے وہ اپنی افرادی قوت کو ختم کرتی چلی جاتی ہے اور بالآخر تباہ ہو کر رہتی ہے۔ اسی ہلاکت کا راستہ شیاطینِ جن و انس ان کو دکھا رہے ہیں۔قتل اولاد کے جرم ہونے کا احساس تو شاید کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے،لیکن قرآن مجید نے اس جرم کی شناعت اور اس کے نتائجِ بد سے دنیا کو سب سے پہلے اس تفصیل سے آگاہ کیا۔تاریخ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔آج اس کی وجہ سے خاندان برباد ہو رہے ہیں۔قومیں افرادی طاقت

---

[۱] مفسر ابن عطیہ کہتے ہیں: الكثير في هذه الآية يراد به من كان يئد من مشركي العرب۔المحرر الوجیز، ۴/۴۶۷

سے محروم ہورہی ہیں۔ یہ تو دنیا کی تباہی ہے۔ آخرت کی بربادی اور وہاں کا نقصان اس سے زیادہ ہوگا۔

اس سلسلے کی چوتھی بات یہ کہی گئی 'وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ' (تاکہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کردیں) اہل عرب کا دین اصلاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا دین تھا۔ یہ شرک اور قتلِ اولاد جیسے ظلم سے پاک تھا، لیکن شیاطینِ جن وانس نے اس میں توحید کی جگہ شرک کو داخل کردیا اور اولاد سے شفقت وہم دردی کی جگہ ان کے قتل کی راہ دکھائی۔ یہ اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دے رکھی ہے۔ دین کے نام پر وہ جو افترا پردازی کررہے ہیں وہ توجہ کے قابل نہیں ہے۔

اسی ذیل میں دو آیات کے بعد ارشاد ہوا:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا أَوْلَادَهُمْ سَفَهاً بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام: ۱۴۰)

بے شک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو حماقت میں بغیر کسی علم کے قتل کیا۔

یہ اس بات کا اظہار واعلان ہے کہ 'قتل اولاد' کسی بھی محرک کے تحت ہو، خسارے اور نقصان کا عمل ہے۔ یہ سراسر جہالت اور جاہلیت کا مظاہرہ ہے۔ اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے کوئی علمی، دینی، اخلاقی اور سماجی جواز فراہم کرنا ممکن نہیں ہے۔[1]

دختر کشی کی ممانعت

'قتل اولاد' سے یہاں خاص طور پر دختر کشی مراد ہے۔ اس لیے کہ زیادہ تر اسی کا ارتکاب ہوتا تھا۔ لڑکے کی جان لی جائے یا لڑکی کی وہ قتل اولاد ہے۔ اسلام دونوں میں

---

[1] عرب میں قتل اولاد کے رواج، اس کے محرکات اور قرآن کی تعلیمات کو سورۂ انعام کی مذکورہ آیت کے ذیل میں مفسرین نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸ء، جلد ۵، جزء ۷، ص ۶۰ اور ۶۴۔ رازی، التفسیر الکبیر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۰ء، جلد ۷، جز ۱۳، ص ۱۶۸-۱۷۰-۱۷۲۔ خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، بغوی، معالم التنزیل، ۲/ ۱۵۱-۴۵۳

فرق نہیں کرتا۔

دختر کشی کے خلاف اسلام نے پوری شدت سے آواز بلند کی اور کہا کہ لڑکی کو حقِ زیست حاصل ہے۔ وہ زندہ رہے گی۔ جو کوئی اس کے اس حق پر دست درازی کرے گا، قیامت کے روز اس کی باز پرس سے بچ نہ سکے گا۔

وَإِذَا الْمَوْؤُودَةُ سُئِلَتْ. بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ۔ (التکویر:۸،۹) اور جب زندہ درگور کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں وہ ماری گئی۔

یہ سوال بہ ظاہر اس سنگ دل باپ اور شقی القلب ماں سے ہونا چاہیے جنھوں نے ایک معصوم بچی کو اپنے ہاتھوں سے زیر زمین کیا تھا۔ اس کی جگہ اس بچی ہی سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے کیا جرم کیا تھا کہ تمھیں یہ ہول ناک سزا دی گئی۔ وہ جب بتائے گی کہ اس کی آنکھیں کھلی بھی نہ تھیں کہ بند کر دی گئیں اور دنیا کو جی بھر کر دیکھنے سے پہلے ہی اسے ختم کر دیا گیا تو ظالم ماں باپ کی زبانوں پر تالے لگ جائیں گے اور وہ اپنے ظلم کی کوئی توجیہ نہ کر سکیں گے۔

آیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ اس وقت مسلمان تھوڑی سی تعداد میں تھے، جو انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ان کا کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا کہ ان کے درمیان اس بربریت کا مظاہرہ ہو رہا ہو، بلکہ یہ عرب کے بعض قبائل کا مسئلہ تھا، لیکن اس کے باوجود قرآن نے اس مسئلہ کو پورے زور سے اٹھایا۔ اور اپنے ماننے والوں کو دعوت دی کہ وہ اس کے خلاف کھڑے ہوں۔ اسلام ہر طرح کے ظلم کے خلاف ہے۔ وہ کسی بھی فرد یا جماعت پر ظلم کو برداشت نہیں کرتا اور اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔

معاشی محرک اور اس کا سدّ باب

قتل اولاد، خاص طور پر لڑکیوں کے قتل کے محرکات میں ایک بڑا محرک غربت اور افلاس بھی تھا۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ لڑکی حصول معاش میں تو کچھ زیادہ معاون نہیں ہوتی، بلکہ بوجھ ہی بنی رہتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی وجہ سے ان کے احتیاج

اور تنگ دستی میں مزید اضافہ ہو۔ فقر و فاقہ نہ بھی ہو تو محض اندیشۂ فقر سے وہ یہ بھیانک اقدام کر بیٹھتے تھے۔

قرآن نے کہا کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو مخلوق پیدا ہوتی ہے وہ اپنا رزق لے کر آتی ہے، کسی دوسرے کا رزق نہیں کھاتی، اس لیے یہ نہ سمجھو کہ تمھاری اولاد تمھارا رزق تم سے چھین رہی ہے، وہ نہ ہوگی تو تم آسودہ رہو گے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءًا كَبِيرًا۔ (الاسراء:۳۱)	اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ایک بڑی غلطی ہے۔

یہ بات صاحب حیثیت افراد سے کہی گئی جو اولاد کی پیدائش کی وجہ سے معاشی تنگی کے خدشات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غریبوں اور ناداروں کو بھی اس سے منع کیا گیا۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (الانعام:۱۵۱)	افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں بھی رزق دیں گے اور انھیں بھی۔

مطلب یہ کہ فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل اولاد جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب نہ کرو۔ اس سے تم پر رزق کے دروازے نہیں کھل جائیں گے۔ اللہ روزی رساں ہے۔ یقین رکھو وہ تمھیں بھی بھوکا نہیں رکھے گا اور تمھاری اولاد کو بھی کھلائے گا۔ رسول اللہ سے دریافت کیا گیا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا:

اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ مَخَافَةَ اَنْ يَّطْعَمَ مَعَکَ[1]	تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کردو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی۔

یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن نے تلاش معاش کا بھی حکم دیا ہے۔ اسے جاری رکھنا بہت بڑا کارِ ثواب ہے۔ اس سے رزق کی راہیں کھلتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس مظلوم اور نازک صنف کی حمایت میں جو آواز بلند کی،

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب قولہ تعالیٰ فلا تجعلوا اللہ اندادا۔ مسلم، کتاب الایمان، باب کون الشرک اقبح الذنوب و بیان اعظمھا بعدہ۔

جو ہدایات اور تعلیمات دیں آج تک کوئی بھی مدعی حقوقِ نسواں ان سے زیادہ صحیح اور حقیقی تعلیمات نہ پیش کر سکا۔ آپ نے فرمایا کہ ماں کی نافرمانی اور زندہ لڑکیوں کو زیر زمین کر دینا غیر اخلاقی حرکت ہی نہیں، ایک فعلِ حرام کا ارتکاب ہے، ارشاد ہے:

انّ اللّٰہ حرّم علیکم عقوق الأمھات ومنعاً وھات و وأد البنات۔[۱]	اللہ نے حرام کی ہے تم پر ماؤں کی نافرمانی، ادائے حقوق سے ہاتھ روکنا اور ہر طرف سے مال بٹورنا اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔

لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت پر جنت کی بشارت

رسول اللہ ﷺ نے لڑکیوں کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیا، ان سے محبت، ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ کیا، اس کی فضیلت بیان کی، اس پر جنت کی بشارت دی، لڑکے اور لڑکی کے درمیان برتاؤ میں فرق کو ناپسندیدہ اور غلط قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من کانت لہ انثٰی فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یوثر ولدہ علیھا یعنی الذکور ادخلہ اللہ الجنۃ۔[۲]	جس شخص کے لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ درگور نہ کرے، اس کے ساتھ حقارت آمیز سلوک نہ کرے اور اس پر اپنے لڑکوں کو ترجیح نہ دے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے جنت میں آپ کی رفاقت اسے حاصل ہوگی۔

من عال جاریتین حتّٰی قد ادرکتا دخلت الجنۃ انا وھو کھاتین و اشار باصبعیہ السبابۃ والوسطیٰ، بابان	جس نے دو لڑکیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں تو میں اور وہ (انگشت شہادت اور درمیان انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے

---

[۱] بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین

[۲] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامیٰ۔ حاکم، المستدرک ج۴، ص۱۹۶

معجلان عقوبتهما فی الدنیا البغی و العقوق۔[1]

فرمایا) اس طرح جنت میں داخل ہوں گے۔ دو دروازے ہیں، جن سے دنیا میں بہت جلد عذاب داخل ہوتا ہے: ظلم و تعدی اور نافرمانی۔

حدیث کے آخری جملہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ ظلم کی عمر ویسے بھی مختصر ہوتی ہے، لیکن ظلم کے تیر جن کے ہدف اپنے ہی جگر گوشے ہوں، ظالم کو زیادہ مہلت نہیں دیتے۔ وہ جلد اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔[2]

عورت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زوجین (مرد اور عورت) کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس لیے ان کی آبادی ایک دوسرے کے برابر ہوتی ہے۔ عام حالات میں اس تناسب میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مرد اور عورت مل کر اس تناسب کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے، اسے کسی مصنوعی طریقہ سے تبدیل کرنا مرد اور عورت دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ بات کہ کس جوڑے سے لڑکے یا لڑکیاں پیدا ہوں؟ کس سے لڑکوں اور لڑکیوں کا سلسلہ جاری رہے؟ اور کون سا جوڑا بانجھ رہے؟ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم و حکمت کے تحت فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے:

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَآءُ إِنَاثاً وَّيَهَبُ لِمَن يَّشَآءُ الذُّكُورَ. أَوْيُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَاناً وَّإِنَاثاً وَّيَجْعَلُ

اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے یا انھیں لڑکوں اور

---

[1] حاکم، المستدرک علی الصحیحین، کتاب البر والصلۃ، حدیث نمبر ۷۳۵۰ و رواہ الترمذی غیر قولہ بابان معجلان

[2] اسلام نے عورت کو ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے جو مقام عطا کیا ہے اور جو حقوق دیے ہیں اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'عورت اور اسلام' بحث 'مسلمان عورت گھر اور خاندان میں' مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵، طبع ۲۰۰۹ء

مَن يَّشَآءُ عَقِيمًا إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ۔ (الشوریٰ: ۴۹، ۵۰)

لڑکیوں کے جوڑے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ بے شک وہ علم والا اور قدرت والا ہے۔

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ تخلیق اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے لے آتا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی نے انسان کو وجود دیا۔ اس کے سلسلۂ نسل کو جاری رکھنے کے لیے وہ کسی کو لڑکیاں اور کسی کو لڑکے عطا کرتا ہے، کسی کو دونوں طرح کی اولاد سے نوازتا ہے۔ اس کی حکمت کے تحت کوئی اولاد سے محروم بھی ہوتا ہے۔ جب انسان کا وجود و بقا مرد اور عورت دونوں کا رہینِ منت ہے تو ان میں سے کسی کے برتر اور کم تر یا کسی کے مفید اور غیر مفید ہونے کا سوال ہی بے معنٰی ہے۔

آیت میں اولاد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہبہ اور عطیہ کہا گیا ہے۔ لڑکا بھی اس کا عطیہ ہے اور لڑکی بھی عطیہ ہے۔ ہبہ کرنے والا کوئی بہتر چیز ہبہ کرتا ہے۔ اس پر ناگواری کا اظہار یا اسے بوجھ سمجھنا اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کی توہین ہے۔ اولاد میں پہلے لڑکیوں کا ذکر ہے۔ بعض اوقات لڑکیوں کی پیدائش ناگوار گزرتی ہے۔ آیت اس غلط نفسیات پر ضرب لگاتی ہے۔ قرآن مجید نے لڑکی کی ولادت کو بشارت کہا ہے۔ (النحل: ۵۸) اس کی پیدائش ماں باپ کے لیے خوش خبری ہے، لیکن نادان انسان اسے خبرِ بد سمجھتا ہے۔

مرد اور عورت تہذیب کے معمار

دنیا میں بہت سی تہذیبیں اور تمدن وجود میں آئے۔ لیکن عورت کو غیر مفید اور مخلِ تمدن عنصر سمجھ کر میدانِ عمل سے دور رکھا گیا۔ اس نے کوئی کردار ادا بھی کیا تو اسے تسلیم نہ کیا گیا اور اس کی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اسی لیے تہذیب و تمدن پر مرد کا غلبہ رہا۔ اس کی فکر، خواہشات اور جذبات چھائے رہے اور عورت کنارے پر کھڑی رہی۔ قرآن

مجید نے بتایا کہ تہذیب وتمدن کو وجود میں لانے اور اسے ایک رخ دینے میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیب کو بداخلاقی کی راہ پر لگانے اور راہ راست سے ہٹانے میں بھی دونوں کی کوششوں کا دخل ہوتا ہے اور ان کے باہمی تعاون ہی سے تہذیب کو صحیح سمت بھی ملتی ہے۔ منافق اور بے ایمان مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہوتا ہے اور وہ معاشرہ کو ناپاک کرنے اور اعلیٰ قدروں سے محروم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

الْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنٰفِقُونَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (التوبۃ: ٦٧)

منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں۔ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ روکے رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے بھی انھیں فراموش کر دیا۔ بلاشبہ منافق بڑے ہی نافرمان ہیں۔

اس کے بعد ان کے انجام کا ذکر ہے کہ منافقین اسی طرح کفار (اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار کرنے والے) معاشرے کو غلط رُخ پر لے جاتے ہیں، اس لیے ان کے مرد اور عورتیں آخرت میں نارِ جہنم کے مستحق ہوں گے، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور وہ اس کی رحمت سے دور ہوں گے۔ (التوبۃ: ٦٨)

منافقین اور منافقات کے ناپاک رویہ کے برعکس اہل ایمان مرد وخواتین معاشرے کو حق وصداقت کی راہ پر لگانے، بھلائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں سے پاک کرنے میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں۔ اسی سے ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكوٰةَ وَيُطِيعُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (التوبۃ:۷۱)

دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ ضرور رحم کرے گا۔ بلاشبہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے ان ایمان والے مردوں اور عورتوں سے کہ وہ انھیں ایسی جنتیں عطا کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ان کے لیے پاکیزہ مکانات ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اس سے بڑی کوئی اور کامیابی نہیں ہے۔[۱] (توبہ:۷۲)

اسلام کا خطاب مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ اس کی تاریخ ہی یہ ہے کہ دونوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، اس کی تبلیغ و اشاعت کی سعی کی، تکلیفیں اٹھائیں، اپنا وطن عزیز چھوڑا، ہجرت اختیار کی اور جب حکم ہوا تو دین کے غلبہ کی جدو جہد اور جہاد میں اپنا حصہ ادا کیا۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں اہل ایمان کی قلبی کیفیت کا بیان ہے کہ اپنی تمام تر خدمات، قربانیوں اور راہ خدا میں استقامت کے باوجود انھیں کوتاہیوں کا احساس دامن گیر ہے اور وہ دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قصور معاف کردے، روز قیامت ہم رسوا نہ ہوں اور تیرے انعام واکرام کے مستحق قرار پائیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَآ أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا

پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو

---

[۱] سورۂ توبہ کی ان آیات کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'مسلمان خواتین کی ذمے داریاں' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

وَأُخْرِجُواْ مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُواْ فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُواْ وَقُتِلُواْ لأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الأَنْهٰرُ ثَوَاباً مِّن عِندِ اللّهِ وَاللّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ۔
(آل عمران: ۱۹۵)

یا عورت۔ تم آپس میں ایک ہی ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انھیں میری راہ میں تکلیف دی گئی اور جو لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں ان کی غلطیاں معاف کروں گا اور انھیں ایسے باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بدلہ ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اسلامی معاشرے کی صورت گری میں مسلمان مرد و خواتین کی ایک دوسرے کو رفاقت حاصل رہی۔ اس کی ترقی کے ہر ہر مرحلہ میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ یہ تاریخ کی شہادت ہے۔ آج بھی یہ معاشرہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور اس کے قیام کے لیے جدو جہد کریں۔

مشترک قانون شریعت

قدیم مذاہب میں مرد اور عورت کی ایک حیثیت نہیں تھی۔ مرد کی سطح عورت سے اونچی تھی، اس لیے دونوں کے لیے الگ الگ قوانینِ حیات تجویز کیے گئے، لیکن اسلام کا مخاطب 'انسان' ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت کا بارِ امانت کائنات کی کوئی مخلوق نہ اٹھا سکی۔ یہ بار صرف انسان نے اٹھایا ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں داخل ہیں:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الانِسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوماً جَهُولاً.

ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے 'امانت' پیش کی، لیکن انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ (لیکن) انسان نے اسے اٹھالیا۔

لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيْماً ۔ (الاحزاب:۷۲،۷۳)

بلاشبہ وہ بڑا ظالم اور بڑا نادان تھا۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو عذاب دے اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں پر اپنی شفقت و رحمت کے ساتھ توجہ کرے اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات میں 'امانت' کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد احکامِ دین اور شریعت کی عائد کردہ ذمہ داریاں ہیں۔ اس میں خدا اور بندے کے تمام حقوق آتے ہیں۔ ان کو امانت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت پر عمل کرنے کی ذمے داری انسان پر ڈالی ہے اور اس کے ادا کرنے کا اسے پابند بنایا ہے۔

امانت کا ادا کرنا قابل ستائش ہے اور اس پر اجر و ثواب بھی ہے۔ اس کے لیے اختیار ضروری ہے۔ اگر کسی پہاڑ پر یا زیر زمین کوئی امانت رکھ دی جائے اور وہ غائب ہو جائے تو پہاڑ اور زمین سے باز پرس نہ ہوگی اور محفوظ مل جائے تو ان کی تعریف نہ ہوگی۔ آسمان، زمین اور پہاڑوں نے بارِ امانت اٹھانے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اختیار سے محروم ہیں اور جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ انجام دے رہے ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ وہ اس امتحان کے لیے نہیں تیار ہوئے کہ حقِ امانت ادا کر کے مستحق ثواب اور خیانت کر کے گرفتارِ عذاب ہوں، لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔ اس کے نتائج بھی اس کے سامنے تھے کہ وہ امانت ادا کر کے انعام و اکرام کا مستحق ہوگا اور خیانت ہو تو اس کی پاداش بھی اسے بھگتنی پڑے گی۔[۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے ازل میں جو بارِ امانت اٹھایا وہ احکام

---

[۱] ان آیات پر تفصیلی بحث اور مختلف اقوال کے لیے ملاحظہ ہو قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷، جزء ۱۴، ص ۱۶۲- ۱۶۵۔ رازی، التفسیر الکبیر، جلد ۱۳، جزء ۲۵، ص ۲۰۲- ۲۰۵۔ بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ۱۹۸۸ء، ۲/۲۵۴

شریعت کا بار تھا۔ اب اس کے مرد اور عورت دونوں کو اس کی جزا یا سزا بھی ملے گی۔ جو مرد یا عورت کفر و نفاق اور شرک و الحاد میں مبتلا ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اس کی توجہ اور عنایت ان خوش نصیب مردوں اور عورتوں کو حاصل ہوگی جو سرمایۂ ایمان اپنے ساتھ رکھیں گے اور وہ انعام و اکرام سے نوازے جائیں گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اسلام نے عورت کی تعلیم کی جو ترغیب دی ہے اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ زبانی طور پر دین کی تعلیمات سے واقف ہوجائے، بلکہ اس میں کتابی علم بھی شامل ہے۔ کتابی علم سے مراد پڑھنا اور لکھنا دونوں ہی ہے۔ اس کے بغیر اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن تعلیم کے اس تصور کے خلاف حضرت عائشہؓ سے ایک حدیث روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاتسکنوھن الغرف و لا تعلّموھن الکتابۃ وعلّموھن المغزل وسورۃ النور۔	عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو، ان کو کتابت کی تعلیم نہ دو، انھیں سوت کاتنا اور بننا سکھاؤ اور سورۂ نور کی تعلیم دو۔

اس حدیث کی بنیاد پر متقدمین میں بعض علماء کی یہ رائے رہی ہے کہ عورت کی اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ وہ کتاب پڑھ سکے۔ اسے تحریر و کتابت سکھانا صحیح نہیں ہے۔ بعد کے دور میں بھی اس خیال کے حاملین رہے ہیں۔ لیکن حسب ذیل وجوہ سے یہ روایت اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کوئی استدلال کیا جائے:

۱- اس حدیث میں کئی ایسی باتیں آئی ہیں جو اسلام کے مزاج اور اس کی عمومی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

۲- کوئی شخص جب تک پڑھنے اور لکھنے پر قادر نہ ہو اسے تعلیم یافتہ یا 'پڑھا لکھا' نہیں کہا جاتا۔ اسلام کا منشا بہ ظاہر یہ ہے کہ عورت تعلیم سے آراستہ ہو۔ اس کے لیے صرف پڑھنے کی صلاحیت کافی نہیں ہے۔ اسے لکھنے اور تحریر کے ذریعے اپنا مافی الضمیر

ادا کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

۳- اس روایت کے غلط اور نا قابل قبول ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا عمل اس کے خلاف تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد ان کے نام مدینہ سے باہر کے علاقوں سے جو خطوط آتے تھے، خود ان ہی کی ہدایت پر، عائشہ بنت طلحہؒ ان کا جواب دیا کرتی تھیں۔

۴- یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اس کے راویوں میں محمد بن ابراہیم شامی ہے، جسے محدثین نے کذّاب، منکر الحدیث اور حدیث گھڑنے والوں میں شمار کیا ہے۔

اس مضمون کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی آئی ہے۔ اس کا ایک راوی جعفر بن نصر 'متہم بالکذب' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ثقہ راویوں کا نام لے کر غلط اور باطل روایات نقل کرتا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ یہ روایت ایک ایسی حدیث کے خلاف ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے۔ حضرت شفاء بنت عبداللہؓ کہتی ہیں کہ میں حضرت حفصہؓ کے پاس تھی کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا:

الا تعلّمین هذه رقیة النملة کما علّمتها الکتابة۔[1]	کیا تم ان کو مرض 'نملہ' کی دعا نہیں سکھاؤ گی جس طرح تم نے انھیں کتابت سکھائی ہے۔

یہ مسند احمد اور ابوداؤد کی روایت ہے اور صحیح ہے۔ یہ حدیث اس سے قوی تر سند سے مستدرک حاکم میں موجود ہے۔[2]

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی۔ مسند احمد، ۷/۵۱۶، حدیث نمبر ۲۶۵۵۔ حدیث شفاء بنت عبداللہ۔ مرض 'نملہ' میں آدمی کے بازو پر دانے نکل آتے ہیں جو بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں اور مریض کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چیونٹیاں مسلسل حرکت کر رہی ہوں۔

[2] البانی، سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ وشیٔ من فقہہا وفوائدھا، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، المجلد الاول، ص ۳۴۰، حدیث نمبر ۱۷۸

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شفاءؓ لکھنا جانتی تھیں۔ حضرت حفصہؓ کو انھوں نے اس کی تعلیم دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصویب و تائید فرمائی۔ اگر یہ عمل غلط ہوتا تو حضرت شفاءؓ کو اس کی تعلیم سے اور حضرت حفصہؓ کو اس کے سیکھنے سے منع فرماتے۔

علامہ خطابیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خواتین کے لیے کتابت کی تعلیم ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اس سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم کا جواز نکلتا ہے۔

علامہ ابن عبدالسلام محمد ابن تیمیہؒ (صاحب منتقی الاخبار) کے نزدیک اس حدیث سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم کا جواز نکلتا ہے۔[1]

☆☆☆

---

[1] اس موضوع پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی (صاحب عون المعبود) کا رسالہ 'عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابة للنسوان' کے نام سے موجود ہے۔ اس میں دونوں طرح کی احادیث پر محدثانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور اہل علم کا نقطۂ نظر بیان ہوا ہے۔ رسالہ فارسی میں ہے۔ یہی رسالہ اس وقت پیش نظر ہے اور بیش تر حوالوں کے لیے اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث میں ان خواتین کو کتابت کی تعلیم دینے سے منع کیا گیا ہے جن کے لیے وہ فساد اور بگاڑ کا سبب بن جائے۔

علامہ البانی نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک موضوع حدیث، جس کی ہر سند انتہائی کم زور ہے، اس کی بنیاد پر اس طرح کی بات کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کتابت سیکھنے، بلکہ مطلق علم حاصل کرنے سے کوئی بھی آدمی فتنہ وفساد میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق صرف عورتوں سے نہیں، کتنے ہی مرد ہیں جن کی تحریریں ان کے دین و اخلاق کے لیے نقصان دہ ہیں، اس وجہ سے کیا حصول علم ہی سے سب کو منع کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس سے مرد اور عورت دونوں ہی کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ وأثرہا السیئ فی الامۃ، المکتب الاسلامی، بیروت، لبنان، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء، ۵/ ۳۰، حدیث نمبر ۲۰۱۷۔ نیز سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، المجلد الاول، الجزء الثانی، ص ۳۴۶، ۳۴۷۔

تفسیر قرآن میں
غلام احمد پرویز پر مستشرقین کے اثرات

ڈاکٹر محمد شہباز منج

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) برِّصغیر میں وہ پہلے مفسر تھے جنھوں نے مغربی فکر سے متاثر ہو کر تجدّد پسندانہ تفسیری نقطۂ نظر اختیار کیا۔ آگے چل کر اس خطہ میں ان کے زاویۂ فکر کو جن اہلِ تفسیر نے اپنایا اور مذکورہ تناظر میں اسے مزید وسعت دی ان میں پاکستان کے معروف تجدّد پسند مفسر غلام احمد پرویز (۱۹۰۳ء۔۱۹۸۵ء) کا نام نمایاں ہے۔ پرویز صاحب مغربی اہلِ قلم کے نتائجِ فکر سے خاصے متاثر ہیں اور اسلام کی ایسی تعبیر پیش کرنا چاہتے ہیں جو مغربی افکار وخیالات سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ انھوں نے اپنی تجدّد پسندانہ فکر کی ترویج واشاعت کی غرض سے متعدد کتابیں تحریر کیں، جن میں من ویزداں، ابلیس وآدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت، جہانِ فردا، کتاب التقدیر، معارف القرآن، مفہوم القرآن اور مطالب الفرقان وغیرہ مشہور ہیں۔ ان کی قریباً تمام تصانیف میں مغربی فکر سے موافقت کی خواہش واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں ہمارا مقصود بالخصوص ان کی تفسیر مطالب الفرقان (جو سات جلدوں میں ہے اور جسے وہ سورۂ الحجر تک لکھ پائے تھے کہ پیغامِ اجل آپہنچا) پر مذکورہ پہلو سے گفتگو کرنا ہے۔

تفسیری اصول

سب سے پہلے یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ پرویز صاحب نے اپنی تفسیری نگارشات کے لیے کون کون سے تفسیری اصول متعین کیے ہیں۔ مطالب الفرقان کے

دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ابتداً میں نے مروّجہ قدامت پسندانہ طریق پر قرآن کا مطالعہ کیا، لیکن جب حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور پرکھنے کا شعور پیدا ہوا تو میں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا تھا وہ مجھے حقیقت سے بہت دور لے گیا تھا۔ برسوں تک میں ریب وتشکیک کی پُرخار وادیوں میں وقفِ کرب واضطراب رہا۔ بالآخر میری قسمت نے یاوری کی اور یہ حقیقت میری سمجھ میں آئی کہ قرآن کے سمجھنے کا صحیح طریق کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو نور یعنی روشنی کہا ہے اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے۔ اسے تلاش کرنے کے لیے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قرآن خود قرآن ہی سے سمجھا جا سکتا ہے''۔[۱] ایک اور جگہ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے بعد اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سرِ دست آپ کی سمجھ میں نہ آتی ہوں، تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعیٔ ناکام نہ کیجیے، بلکہ قرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجیے، تا آں کہ مزید تحقیق وتدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔ ... ہمارے تمام رجحانات ومعتقدات قرآن کے تابع ہونے چاہئیں اور بس۔''[۲]

ایک اور اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قرآن بلسانٍ عربیٍ مبین نازل کیا گیا ہے۔ علم اللسانیات کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر واشگاف ہو چکی تھی کہ مرورِ زمانہ سے زبانوں کے الفاظ کے معانی میں کس قدر فرق آ جاتا ہے، اس لیے قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے ضروری ٹھہرا کہ یہ دیکھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں ان الفاظ کے کیا معانی سمجھے جاتے تھے۔[۳] چنانچہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے محاورۂ عرب کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔[۴] قرآن مجید کا ترجمہ چوں کہ ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے عربی زبان کی مستند کتبِ لغت وتفسیر کی مدد سے قرآن

مجید کے تمام الفاظ کے معانی پوری وسعت و جامعیت کے ساتھ متعین کیے جائیں اور اس کے لیے جہاں تک ہوسکتا ہو، پیچھے جائیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزولِ قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے کیا مفہوم لیا جاتا تھا''۔۵

انھوں نے قرآن فہمی کا ایک اور طریقہ تصریفِ آیات بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''قرآن کا انداز دیگر کتابوں کا سا نہیں۔ اس کے متعلق یوں سمجھئے کہ جیسے یہ تیئس سال کے عرصے کے ارشاد فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آتی ہے تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر، اضافہ کسی اور جگہ، استثناء کسی اور سورہ میں۔ اس طریق سے اس نے اپنی اصطلاحات کا مفہوم بھی متعین اور واضح کیا ہے''۔۶

قرآن کریم کو سمجھنے کی اگلی شرط ان کے نزدیک تدبر فی القرآن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''قرآن مجید کو تقلیداً سمجھا جاسکتا ہے نہ کسی اور کا فکر و تدبر دوسرے کے لیے سند و حجت ہوسکتا ہے۔ تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں ایک اور حقیقت یہ بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ قرآن کی رو سے جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے قرآنی دعاوی کی صداقت نکھر کر سامنے آتی جائے گی۔ لہٰذا قرآن کریم میں غور و تدبر کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانہ میں علم انسانی جس سطح پر پہنچ چکا ہے اس پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہی معلوم نہ ہو کہ اس زمانہ کے تقاضے کیا ہیں اور انسانی فکر کی کاوشیں ان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچی ہیں تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کرسکے گا''۔۷

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ان کے نزدیک اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے بعض احکام متعین ہیں اور بعض اصول و اقدار کی شکل میں ہیں۔ جہاں تک اصول و اقدار کا تعلق ہے، ان کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں، بلکہ انہیں اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان پر عمل پیرا ہونے کے طریق وضع کرے۔ اس طرح امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوگی اور برقرار رہے گی۔ تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے:

''جب تک آپ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کر لیں گے، قرآن کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے اپنے خیال کی سند اور تائید قرآن سے حاصل ہو جائے اس کی رسائی صداقت تک نہیں ہو سکتی''۔۸

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے سے ایک عقیدہ قائم کر لیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لیے قرآن مجید کی ورق گردانی کریں تو یہ 'تدبر فی القرآن' کا ایسا طریقہ ہے جسے درحقیقت 'تدبر فی القرآن' کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن مجید کو اپنے خیالات وتصورات کے تابع لے آنا بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے دلوں پر مہریں لگتی اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں''۔۹

تفسیری رویہ

اس بحث سے قطع نظر کہ پرویز صاحب کے بیان کردہ درج بالا تمام اصول فہم قرآن صحیح ہیں یا غلط، جو بات ایک عام قاری کو بھی ان کے تفسیری لٹریچر کے مطالعہ کے دوران کھٹکتی ہے وہ ان کا اپنے وضع کردہ اصولوں سے انحراف ہے۔ درج بالا اقتباسات میں تفسیرِ قرآن کے حوالے سے انھوں نے جس بڑی جسارت کا ذکر کیا ہے ان کے تفسیری لٹریچر میں یہ جسارت جا بہ جا کی گئی ہے۔ وہ جگہ جگہ اپنے وضع کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کھینچ تان کر ایسا نقطۂ نظر اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مغربی فکر سے زیادہ سے زیادہ میل کھاتا ہو۔ عبدالرحمان طاہر سورتی (جنھوں نے ان کی لغات القرآن پر نظر ثانی کی تھی) ان کی قرآن فہمی سے متعلق رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید کے بارے میں پرویز صاحب ایک نئی تفسیر کر دینے کے عادی ہیں اوراس ضمن میں ان کا ایک نیا تلافقرہ وجہ شادابیٔ قلب بنتا رہتا ہے، جس میں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ معنٰی ہمارے موجودہ زمانہ کے علم کے مطابق کیے گئے ہیں۔ جوں جوں تحقیقات کے بعد علمی سطح بلند ہوگی ان کے معانی ومفہوم بدلتے رہیں گے۔''[۱۰]

پرویز صاحب جگہ جگہ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ جو شخص پہلے سے کوئی عقیدہ یا تصور قائم کر کے قرآن کی طرف آئے گا وہ اس سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا قرآن کا مطالعہ خالی الذہن ہوکر کرنا چاہیے، لیکن ان کی یہ اصول پسندی اس وقت دھری کی دھری رہ جاتی ہے جب وہ پرانے زمانے کے یونانی فلاسفہ یا موجودہ دور کے یہودی اور عیسائی ائمہ فکر اور مستشرقین کے نتائج فکر کی قرآن سے تائید مہیا کرنے میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے انسانی زندگی کے اہم مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لیا اور یونان کے فلاسفروں سے لے کر اس وقت تک ان کے متعلق مختلف ائمہ فکر نے جو کچھ کہا ہے اس کا بہ غائر مطالعہ کیا۔ اس طرح ایک ایک مسئلہ کے متعلق انسانی فکر کے اہم گوشے میرے سامنے آ گئے۔ اس کے بعد میں نے انسانی فکر کی اس اڑھائی ہزار سالہ کدّ وکاوش کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کیا (یا قرآن کا مطالعہ اس فکر کی روشنی میں کیا)۔ قرآن کا اس طرح مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا ایک ایک دعوی زندہ حقیقت بن کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کے بعد میرے لیے زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق قرآن کی رہ نمائی کا تعین کچھ مشکل نہ رہا۔ مجھے قرآن کی صداقتوں کا جو یقین اس طرح حاصل ہوا وہ نہ زبان سے بیان ہوسکتا ہے نہ قلم سے ادا۔ ... مدت سے میرا جی چاہتا تھا کہ جس انداز سے میں نے قرآن کو سمجھا ہے اس میں دوسرے اربابِ ذوق وفکر کو بھی شامل

کرسکوں، لیکن یہ مرحلہ بجائے خود بڑا اہمت طلب تھا۔''[۱۱]

پرویز صاحب کا تفسیری اصول تو یہ تھا کہ ''قرآن نے خود کو روشنی کہا ہے اور روشنی اپنے وجود کی دلیل آپ ہوتی ہے، اسے تلاش کرنے کے لیے خارجی چراغوں کی ضرورت نہیں ہوتی''۔ لیکن مذکورہ اقتباس صاف بتا رہا ہے کہ وہ اڑھائی ہزار سالہ انسانی فکر کے چراغ لے کر قرآن کی روشنی تلاش کرنے نکلے تھے۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ ''قرآن کو خالی الذہن ہوکر سمجھنا چاہیے'' لیکن یہاں وہ انسانی فکر کی اڑھائی ہزار سالہ کاوش کو ذہن میں لیے قرآن سمجھنے جا رہے ہیں۔ جب قرآن کی رہ نمائی کا تعین انسانی فکر و فلسفہ کی روشنی میں ہوگا تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کی رہ نمائی انسانی فکر و فلسفہ کی رہ نمائی سے مختلف ہو وہاں کھینچ تان کر اس کے مطابق کر ڈالی جائے۔ پرویز صاحب کے تفسیری رویے کا یہی نتیجہ نکلا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مغربی نقطۂ نظر سے قریب تر لے جانے کے لیے قرآن کی صریح اور متفق علیہ باتوں کی نہایت رکیک اور دور از کار تاویل کرنے یا ان کے معانی و مفاہیم کو یکسر بدل ڈالنے میں کچھ باک محسوس نہیں کرتے۔ پروفیسر عزیز احمد کے بہ قول ''سید احمد خان سے لے کر آج تک تمام جدید پسندوں میں غالباً پرویز وہ واحد شخص ہیں جو مغربی نقطۂ نظر کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ عجیب و غریب اور غیر معقول توضیحی اصطلاحات تخلیق کر کے صحیح نقاطِ نظر کو پامال کر دیتے ہیں۔ انہوں نے مختلف امور سے متعلق قرآنی بیانات کو دور جدید کے تصورات کا جامہ پہنانے کی غرض سے نہایت غلط اور دور از کار تاویلات سے کام لیا ہے''۔[۱۲] پرویز صاحب اپنی من پسند تاویلات میں جس حد تک جاتے ہیں اور ایک غیر جانبدار قاری ان کی تاویلات کے مطالعہ کے دوران جس طرح کے احساس سے دو چار ہوتا ہے اس کی ایک جھلک کے لیے جاوید احمد غامدی کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''تنقید سے پہلے ایک فرد کے بارے میں ممکن حد تک حسن ظن سے کام لینا چاہیے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تفہیم کلام میں غلطی لگ جائے اور یہ وہ بات ہے جس سے کوئی غیر معصوم مستثنیٰ نہیں۔ تاہم بعض 'تحقیقات' ایسی ہوتی

ہیں کہ حسن ظن سے کام لینا آسان نہیں ہوتا۔ پرویز صاحب کا مطالعہ
کرتے وقت بھی ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب صاف معلوم ہوتا ہے کہ
وہ قرآن مجید کی بعض صریح باتوں کو نہیں ماننا چاہتے۔'' ۱۳؎

پرویز صاحب کا مستشرقین اور مغربی اہلِ فکر سے شدید تاثر اس حقیقت سے صاف ظاہر ہے کہ اپنی قرآنی تاویل وتعبیر کی تائید میں وہ بسا اوقات مغربی مفکرین کے اقتباسات ہی پیش فرماتے ہیں اور بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی ''اسلامی مساوات، اسلامی اخلاق اور اسلامی نظامِ معاشرت کی تشریح اسی زاویے سے کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے اس نئے روپ کو دنیا کے سامنے فخر سے پیش کیا جاسکتا ہے اور ایسا کرنے سے مغربی دنیا جوق در جوق اسلام کی طرف ٹوٹ پڑے گی۔ وہ اسلام کو مغربی تہذیب کے شانہ بہ شانہ چلانے کے خیال میں ساری تاریخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں''۔ ۱۴؎

آئندہ سطور میں مذکورہ تناظر میں پرویز صاحب کی قرآنی فکر کا، بالخصوص ان کی تفسیر 'مطالب الفرقان' کی روشنی میں، مختلف عنوانات کے تحت قدرے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

تصورِ الٰہ

تصورِ الٰہ کے سلسلے میں پرویز صاحب کی تفسیری نگارشات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایتی اسلامی تصور کو سختی سے مسترد کرتے اور نیا مغربی تصور اِلٰہ پیش کرتے ہیں۔ خدا کا یہ تصور کہ وہ قادر مطلق ہے، جو چاہے، جب چاہے اور جیسے چاہے، کرسکتا ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں، سب اس کے سامنے جواب دہ ہیں، وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، وہی قابل ستائش و پرستش ہے، مومنین کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، چوں کہ یہ تصور جدید مغربی فکر کے لیے قابل قبول نہیں اس لیے وہ بڑے شد ومد سے اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مغربی اہلِ فکر کی آراء کو بلا جھجک تائیداً نقل کرتے ہیں۔ مغرب میں نشأۃ ثانیہ کے بعد وسیع پیمانے پر یا تو خدا کا انکار ہی کر ڈالا گیا یا

پھر کائنات میں اس کا کردار ایک جدید جمہوری ریاست کے برائے نام بادشاہ سے بھی کم تر تصور کر لیا گیا۔ ایسے ہی تصور خدا کا نتیجہ تھا کہ جدید مغرب میں کائنات کے عام مشاہدے میں آنے والے قوانین میں کسی بھی طرح کی ماورائی مداخلت (جس سے خدا کا قادرِ مطلق ہونا ثابت ہوتا ہے) کو جہالت و وہم پرستی سے تعبیر کیا جانے لگا۔ ۱۵ پرویز صاحب بھی ایسے تصور کو غلط سمجھتے ہیں جس میں خدا کو اختیارِ مطلق حاصل ہو اور وہ کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند نہ ہو۔ قرآنی الفاظ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (الانعام: ۱۲) کی تشریح میں پابندی و اختیار کے حوالے سے خدا اور بندے کی مختلف حیثیتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ ''بندے پر جو پابندی لگائی گئی ہے وہ اس کے خلاف کر سکتا ہے، جب کہ خدا نے اپنے اوپر جو پابندی لگائی ہے وہ اس کے برعکس نہیں کرتا۔'' اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان صاحبِ اختیار رہتا ہے اور خدا 'مجبور'۔'' ۱۶ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (البقرۃ: ۳) کی تفسیر میں تصورِ خدا کی بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''خدا کا جس قسم کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے' مذاہبِ عالم' میں کسی کے ہاں بھی اس قسم کا تصور نہیں تھا (نہ ہے)۔ ان کے ہاں خدا کا تصور 'بادشاہ' کا تصور تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا۔ جس قسم کا جی چاہے حکم دے سکتا ہے، کسی کو اس حکم کی خلاف ورزی تو ایک طرف، یہ پوچھنے کی بھی مجال نہیں ہو سکتی کہ حضور ملکِ معظم نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔... جب محدود قوتوں کے مالک بادشاہ کی مطلق العنانی کا یہ عالم ہوتا ہے تو لامنتہی قوتوں کا مالک، قادرِ مطلق خدا کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند کس طرح ہو سکتا ہے۔ جو جی میں آئے کہے، اور جو جی میں آئے کرے، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور ایسا کیوں کیا۔'' ۱۷

مذکورہ تعبیر میں پرویز صاحب بالبداہۃ خدا کے مسئول و جواب دہ ہونے کا تصور پیش کر رہے ہیں، حالاں کہ یہ نصوصِ قرآنی کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً قرآن میں

ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے: لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْن۔ (الانبیاء:۲۳) ''وہ جو کام کرتا ہے اس کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور (جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کے لیے) وہ جواب دہ ہیں۔''

اللہ پر بھروسہ اور توکل قرآن کی اہم تعلیمات میں سے ہے۔ آں حضورﷺ کو متعدد مقامات پر اللہ پر توکل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (الانفال: ۶۱، الشعراء: ۲۱۷، النمل:۷۹) یہ مومنین کی صفت اور ایمان کا تقاضا ہے۔ (الانفال:۲) یہ آدمی کو شیطان کے فتنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ (النحل:۹۹) اللہ پر توکل کرنے والے ہی نیک انجام اور دائمی نعمتوں کے حق دار ہیں۔ (العنکبوت:۵۸-۵۹) لیکن پرویز صاحب کارل مارکس کا حوالہ دیتے ہوئے، ایسے مذہب کو جس میں خدا پر توکل کیا جاتا ہے، انسان کا خود ساختہ مذہب اور ایسے مذہب کے خدا کو سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔[۱۸]

قرآن کریم کی رؤ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (الذٰریٰت:۵۶) اس میں شبہ نہیں کہ عبادت کا قرآنی مفہوم نہایت وسیع ہے، جو زندگی کے جملہ معاملات میں اللہ کی طاعت وفرماں برداری کو شامل ہے، لیکن عبادت الٰہی کے ذیل میں اللہ کی پرستش، جس میں اس کے حضور قیام اور رکوع وسجود، حج اور قربانی اور کثرت سے اس کی حمد وثنا بیان کرنا شامل ہے، کو بھی نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ ہر چیز کو عبادت کے اول الذکر معنیٰ میں لینا اور موخرالذکر معنیٰ میں یکسر مسترد کر دینا قرآنی تعلیمات سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ نبی کریمﷺ سے بڑھ کر کسی کی پوری زندگی عبادت کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ اس کے باوصف آپؐ کو راتوں میں اٹھ کر قیام کرنے (المزمل:۲، بنی اسرائیل:۷۹) اور دیگر مصروفیتوں سے فارغ ہوکر تنہائی میں اللہ کا ذکر کرنے (المزمل:۶-۷) کا علیٰحدہ طور پر اور خصوصیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ یہ قیام اور ذکرِ الٰہی، ظاہر ہے کہ اللہ کی پرستش ہی ہے اور یہ پرستش بلا شبہ عبادت ہی کے زمرے میں آتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے اِیّاکَ نَعْبُدُ (الفاتحہ:۴) کی تفسیر میں پرستش کے تصور کو سختی سے مسترد کر دیا ہے۔ ان کے مطابق ''قرآن میں عبادت کا لفظ

پرستش کے معنیٰ میں اہل اسلام کی طرف منسوب ہو کر کہیں استعمال نہیں ہوا۔ خدا کی عبادت صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب مسلمانوں کو استخلاف فی الارض حاصل ہو۔ عبادت کو پرستش میں بدل دینے سے دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے''۔ ۱۹؎ خدا کی حمد وثنا، اس کے حضور رکوع وسجود اور اس کی پرستش کے تصور کو پرویز صاحب نے جس طرح رد کیا ہے وہ ان کے ذہن وفکر پر مغرب کے اثرات کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے ایک مقام پر انگریز مفکر باردیو کے ان الفاظ کو تائید اور تحسین کے ساتھ نقل کیا ہے، جن میں وہ کہتا ہے: ''علم الٰہیات کا یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنی حمد وستائش اور جبر وکبریائی کی تعریف وتوصیف کے لیے پیدا کیا، انسانیت کی ذلت ہے۔ نہیں، یہ خود خدا کی شان کے شایان بھی نہیں۔ اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ جو عقیدہ انسان کے لیے وجہ ذلت ہو وہ خدا کے لیے بھی باعثِ ذلت ہوتا ہے۔'' ۲۰؎

تصورِ رسول اللہ ﷺ

اسلام میں رسول اللہ ﷺ کی غیر معمولی عظمت اور بے مثل مقام ومرتبہ محتاجِ بیان نہیں۔ مسلمانوں کے ہاں یہ مسلّمہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ افضل الخلائق، امام الانبیا اور سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص یا اتھارٹی یا نظامِ حکومت آپؐ کی نسبت سے نبی یا رسول کا لقب حاصل کرنے کا مجاز نہیں ہوسکتا۔ آپؐ کی حیثیت کسی عام سیاسی یا معاشرتی نظام یا کسی سلطنت وحکومت کے سربراہ کی سی نہیں کہ آپ کے جانشین آپ ہی کا لقب حاصل کر کے آپ ہی کے مقام پر فائز ہو جائیں۔ لیکن جدید مغرب پسندانہ فکر میں ضروریاتِ زمانہ کی نہایت آزادانہ رعایت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی نسبت سے قائم ہونے والے نظام کا انہی کا منصب حاصل کر لینا معیوب نہیں۔ اس فکر میں حدیث رسولؐ سے انکار کا سبب بھی، بہ قول علامہ محمد اسد، یہی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی تعبیر نام نہاد عقلیت پسندی کے خطوط پر اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ ۲۱؎ چنانچہ پرویز صاحب نے اپنی تعبیراتِ قرآنی میں

رسول اللہ ﷺ کو بلا جھجک نظام حکومت اور مرکزی اتھارٹی کا ہم معنی بنا دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے ''حالاں کہ نظام سے وابستگی اور اطاعت کا تقاضا ہے کہ ایسی باتوں کو رسول (مرکزی اتھارٹی) یا اپنے افسران تک پہنچایا جائے۔''[۲۲] یہی نہیں، بلکہ بعض مقامات پر وہ خدا اور رسول دونوں کو 'مرکز ملت' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ حقیقت کہ اللہ اور رسول سے مرکزِ ملّت (یا نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کا اقتدارِ اعلیٰ) مراد ہے، قرآن کریم میں ایسے واضح الفاظ میں اور اس شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے کہ ان مقامات کو بہ غور دیکھ لینے کے بعد اس میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔''[۲۳]

اطاعت رسول قرآن کی نہایت اہم تعلیم ہے۔ رسولوں کی بعثت کا مقصد ہی ان کی اطاعت بتایا گیا ہے۔ (النساء:۶۴) رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کہا گیا ہے۔ (النساء:۸۰) لیکن غلام احمد پرویز اطاعتِ رسول کے تصور سے واضح طور پر گریزاں نظر آتے ہیں۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْل۔ (النساء:۵۹) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> ''خدا کی ذات تو ایسی ہے کہ اس کا محسوس اور مرئی طور پر ہمارے سامنے آنا تو ایک طرف وہ ہمارے قیاس و خیال، گمان و وہم سے بھی ماورا ہے۔ اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کی جائے؟ اس کے لیے اس نے خود ہی بتا دیا کہ میں نے اپنی کتاب تمہاری طرف نازل کر دی ہے۔ اس کتاب کی اطاعت یا محکومیت میری اطاعت یا محکومیت ہوگی۔''[۲۴]

مذکورہ بالا استدلال انتہائی عجیب ہے۔ خدا تو غیر محسوس اور غیر مرئی ہے، مگر اس کا رسول تو محسوس اور مرئی ہے اور قرآن نے صاف لفظوں میں اس کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے اور اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت بھی قرار دیا ہے، پھر اس کی اطاعت کے بجائے کتاب کی اطاعت والی تعبیر کی کیا ضرورت ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ رسول کی اطاعت کتاب اللہ کی تعلیمات کی پیروی کے ہم معنی ہے، لیکن اطاعت کے لیے بجائے خود جس عملی نمونہ کی ضرورت ہے، وہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی ہو سکتے ہیں اور اسی لیے قرآن نے انہی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ (الاحزاب:۲۱) مزید برآں اگر اطاعتِ کتاب

ہی کا حکم مطلوب تھا تو اطیعوا الرسول کے بجائے اطیعوا الکتاب کہنے میں کون سا امر مانع تھا ؟!

قرآن کے مطابق ایسے لوگ صاحب ایمان نہیں جو اپنے نزاعی معاملات میں رسول اللہ ﷺ کو حَکَم نہیں مانتے اور آپؐ کے کیے ہوئے فیصلے پر اپنے دلوں میں تنگی محسوس کرتے ہیں۔ (النساء: ۶۵) لیکن تجدد پسند فکر ایک زمانے کے فیصلوں کو تا قیامت ماننے کو دقیانوسیت سے تعبیر کرتی اور نئے زمانے میں نئے فیصلوں کے نفاذ اور پرانے فیصلوں کو ضرورتاً بدل دینے میں ترقی وعروج کا راز مضمر پاتی ہے۔ پرویز صاحب اپنے مزعومہ اسلامی نظام، مرکزِ ملت اور سنٹرل اتھارٹی کو مذکورہ تناظر میں مکمل بااختیار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''(اسلامی نظام) سابقہ ادوار کے فیصلوں میں، خواہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں، ردّوبدل کرسکتا ہے اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کرسکتا ہے۔'' ۲۵

ملائکہ، شیطان اور جنات

اسلام ملائکہ، شیطان اور جنات کا ذکر واضح طور پر غیر مرئی واقعی وجودات کے طور پر کرتا ہے۔ یہ تصور مختلف دیگر مذاہب میں بھی موجود رہا ہے، لیکن یورپ میں جدید سائنسی ومادی افکار کے زیر اثر ان غیر حسّی وغیر مرئی مخلوقات کے انکار کا رجحان پیدا ہوگیا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے مقالہ نگار کے مطابق ''جدید عقلیت پسند Demons کے وجود کو قدیم انسانوں کے توہمات سے تعبیر کرتے ہیں، جن کا ان لوگوں کے اپنے ذہنوں کے سوا کہیں وجود نہیں۔ اس خیال کی اشاعت میں معروف ماہرِ نفسیات سگمنڈ فرائڈ کا خصوصی حصہ ہے''۔ ۲۶ تجدد پسند مسلم اہل فکر کا مذکورہ مغربی فکر سے تاثر ان مخلوقات کے غیر مرئی خارجی وجود سے انکار پر منتج ہوا۔ غلام احمد پرویز بھی اس فکر کے زیرِ اثر ملائکہ، شیطان اور جنات کو الگ اور مستقل غیر مرئی مخلوقات تسلیم نہیں کرتے۔

قرآنِ حکیم کی متعدد آیات میں ان مخلوقات کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اس سے نہایت صراحت کے ساتھ ان کا ذاتی تشخص اور خارجی وجود ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ

کہ وہ دو دو تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔ (فاطر:۱) انسان کے دائیں بائیں بیٹھے اس کے اعمال لکھ رہے ہیں۔ (قٓ:۱۷) انسانوں کی روحیں قبض کرتے ہیں۔ (السجدۃ:۱۱) خدا کے عرش کو اٹھائے ہوئے، اس کے گرد حلقہ باندھے ہوئے ہیں۔ مومنین کے لیے مغفرت، دخولِ جنت اور دوزخ سے بچائے جانے کی دعائیں کرتے ہیں۔ (المومن:۷-۹) لیکن پرویز صاحب ملائکہ کو فطرت کی قوتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''قصۂ آدم میں ملائکہ کا آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا جو ذکر ہے، اس سے مراد درحقیقت فطرت کی قوتوں کا بنی نوع انسان کے لیے مسخّر کیا جانا ہے۔''[۲۷] ان کی اس تعبیر کو فرشتوں سے متعلق قرآن کے مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کے کئی کئی پر ہیں، وہ لوگوں کے اعمال لکھتی اور مومنین کے لیے دعائیں کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں کسی طرح صحیح نہیں۔

شیطان کو بھی قرآنی بیانات ایک خارجی وجود ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ وہ نوعِ جن کا ایک فرد تھا، جس نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی۔ (الکہف:۵۰) اسے کہا گیا کہ جنت سے نکل جا، تو ذلیل وخوار ہے۔ (الاعراف:۱۳) اس نے اللہ سے کہا: مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیجئے۔ (الاعراف:۱۴) اس نے کہا: مجھے تو تو نے ملعون کیا ہی ہے، میں بھی تیرے سیدھے راستے پر لوگوں کو گم راہ کرنے کے لیے بیٹھوں گا۔ (الاعراف:۱۶) لیکن پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ''شیطان کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں، بلکہ انسان کے اپنے فیصلوں، ارادوں اور جذبات سے عبارت ہے۔''[۲۸] اگر اسے مان لیا جائے تو انسان کے فیصلے، ارادے اور جذبات نوعِ جن کا ایک فرد قرار پائیں گے، جنہیں جنت سے نکالا گیا، انہوں نے قیامت تک اللہ سے مہلت مانگی اور کہا کہ ہم لوگوں کو تیرے راستے سے بھٹکائیں گے۔ حالاں کہ یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔

جہاں تک جنات کا تعلق ہے تو ان سے، پرویز صاحب کے نزدیک، قرآن کی مراد جنگلی، صحرائی اور خانہ بدوش انسان ہیں۔[۲۹] لیکن یہ تعبیر عجیب تر ہے۔ شیطان مذکورہ بالا نص قرآنی کے مطابق جنات میں سے تھا۔ اگر جن جنگلی، صحرائی اور خانہ بدوش انسان ہیں تو

شیطان بھی انہی میں سے ہوگا۔ کیا شیطان کے جنت سے نکالے جانے کے وقت اس کے ہم قبیلہ جنگلی، صحرائی اور خانہ بدوش انسانوں کے وجود کا کوئی ثبوت ہے؟ پھر یہ تو جسّم انسان ہیں۔ یہ اپنے فیصلوں، ارادوں اور جذبات سے کیسے عاری قرار پائیں گے؟ مزید برآں غیر جنگلی اور غیر صحرائی لوگوں کے فیصلے، ارادے اور جذبات کیا ہوں گے؟ رہے جنات کے حوالے سے قرآنی بیانات تو وہ ان کے انسانوں سے الگ آتشیں مادہ سے پیدا ہونے والی اور عام نگاہوں سے پوشیدہ ایک مستقل مخلوق ہونے پر اتنے صریح ہیں کہ پرویز صاحب کی تعبیر کو کسی طور پر قبول نہیں کرتے۔ (مثلاً الحجر: ۲۷، الجن: ۶-۹)

قیامت اور جنت وجہنم

قرآن مجید سے صاف واضح ہے کہ قیامت اور جنت وجہنم کا معاملہ صرف روحانی نہیں، بلکہ جسم اور روح دونوں سے متعلق ہے۔ بعث بعد الموت اور انسانوں کا جسمانی طور پر زندہ ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اللہ کے حضور حاضر ہونا قرآن کے ان بنیادی مقدّمات میں سے ہے جن کا اس نے نہایت زور دار الفاظ میں تکرار کے ساتھ اثبات کیا ہے۔ (یٰسٓ: ۵۱-۵۴، بنی اسرائیل: ۴۹-۵۱، الحج: ۵-۷، القیامۃ: ۳-۴) اگر حشر محض روحانی ہوتا تو کیا منکرین و کفار کی اس بحث کے جواب میں کہ مر کر مٹی میں مل جانے اور بوسیدہ ہڈیاں ہو جانے والے اجسام کیوں کر دوبارہ زندہ ہوں گے؟ صرف یہ کہہ دینا کافی نہ ہوتا کہ ہم کب یہ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری بوسیدہ ہڈیاں اور جسم از سر نو زندہ ہوں گے؟ بس تمہاری روحوں کو جمع کر کے حساب کتاب لیا جائے گا۔ اس طرح شاید کفار بھی بار بار معترض نہ ہوتے اور قرآن کو بھی بار بار یہ نہ کہنا پڑتا کہ ہاں ہاں، تمہاری بوسیدہ ہڈیاں اور گلے سڑے جسم ضرور دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ جنت و جہنم اور ان کے نعم و آلام بھی قرآن کے بہت سے بیانات کی رؤ سے محض روحانی قرار نہیں دیے جا سکتے۔ (الدخان: ۴۰-۵۶، الطّور: ۱۳-۲۰، المطففین: ۱۶-۱۷) معاد کے بارے میں حسّی تصورات عیسائیت وغیرہ مذاہب میں بھی موجود ہیں، لیکن یورپ میں سائنسی نشأۃ

ثانیہ کے دور میں جہاں دیگر مذہبی عقائد شکست و ریخت کا شکار ہوئے وہاں معاد سے متعلق نقطۂ نظر بھی تبدیل ہو گیا۔ اب اخروی جزا وسزا صرف روحانی سمجھی جانے لگی اور جنت و دوزخ کی تعبیر محض کیفیات سے ہونے لگی۔[۳۰] مغرب میں ایک طرف تو جسمانی جزا وسزا کے قدیم مسیحی تصور کو نئی تعبیر سے روحانی بنانے کی کوشش کی گئی، دوسری طرف اسلام پر یہ الزام لگایا جانے لگا کہ اس نے بدو عربوں کو متاثر کرنے کی غرض سے مسیحیت وغیرہ مذاہب کی تقلید میں جزا وسزا کے تصور کو حسّی رنگ میں پیش کیا ہے۔ رچرڈ بیل جنت و دوزخ کے اسلامی تصور کو یہودیت، عیسائیت اور زردشت وغیرہ مذاہب سے ماخوذ بتاتا ہے، جنھیں کچھ مقامی رنگ وروغن لگا کر پیغمبرِ اسلام نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً اس کے نزدیک قرآن میں اہل دوزخ کا اہل جنت سے پانی طلب کرنا انجیل میں موجود Lazarus سے مشابہ ہے اور جہنم کا تصور ایتھوپک کے توسط سے عبرانی کے ge-hinnom سے ماخوذ ہے۔[۳۱] ولیم میور کے مطابق قرآن نے جنت وجہنم کے مناظر کو، بے آب گیاہ زمین کے عرب باشندوں کو متاثر کرنے کے لیے، مادی مسرتوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔[۳۲]

معاد سے متعلق غلام احمد پرویز کا تفسیری مواد اس ضمن میں ان کے مغربی اہل فکر سے تاثر کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے۔ لفظ 'جہنم' کو وہ رچرڈ بیل ہی کی طرح عبرانی کے 'جی ہنوم' سے ماخوذ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ''زمانۂ قدیم میں یروشلم کے جنوب میں ایک وادی تھی، جس میں ملوک دیوتا کا مندر تھا۔ وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس دیوتا کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی۔ عبرانی زبان میں وادی کو جی کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف وہ وادی منسوب تھی اس کا نام ہنوم تھا۔ اس بنا پر اس وادی کو، جس میں انسانوں کو جلا کر قربان کیا جاتا تھا 'جی۔ ہنوم' (یا جہنم) کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جہنم سے مراد 'انسانیت کی قربان گاہ' ہوگا اور عذاب جہنم کا مفہوم ہوگا انسانیت سوز عذاب، خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن اپنے بسیط حقائق کو محسوس تشبیہات وتمثیلات کے ذریعہ سمجھاتا ہے۔ ایسے ہی اس نے جہنم کی کیفیت سمجھائی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جہنم کسی

گڑھے یا ایسے مقام کا نام نہیں جس میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اور مجرموں کو اس میں جھونک دیا جائے، بلکہ دراصل یہ انسان ہی کے قلب سوزاں کی کیفیت اور اعمال بد کے نتیجے میں اس کے اندر پیدا ہو جانے والے اضطرابِ پیہم اور کربِ مسلسل کا نام ہے''۔[۳۳] جنت بھی پرویز صاحب کے نزدیک تمثیلی و تشبیہی اور ایسی مثالوں سے عبارت ہے جو قرآن کے اولین مخاطب عربوں کے لیے متاثر کن تھیں۔'' گھنے باغات، جن میں صاف شفاف چشمے ہوں اور ان کا ٹھنڈا پانی چاروں طرف بہہ رہا ہو، درخت پھلوں سے لدے، دودھ اور شہد کی ایسی افراط کہ گویا ان کی نہریں بہہ رہی ہوں، اعلیٰ درجے کے قالین اور صوفے بچھے ہوئے محلات، جن میں حریر واطلس کے پردے آویزاں، بلّوریں آفتابے، چاندی سونے کے ظروف، لطیف گوشت، خوش ذائقہ مشروبات، ہم مزاج، ہم رنگ، یک آہنگ احباب کی محفلیں، بنتے ہوئے صحراؤں کے باشندوں کی زندگی، ظاہر ہے، اسی طرح کی مثالوں سے سجائی جا سکتی تھی''۔[۳۴] ایک دوسری جگہ جنت وجہنم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' جنت انسانی زندگی کی مزید (اگلی اور بلند بالا) ارتقائی منازل طے کرنے کا نام ہے اور جہنم اس کے ارتقاء کے رک جانے کا نام۔''[۳۵] یوم الحساب کے سلسلہ میں، انسانوں کے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کی عدالت میں اپنے اعمال کا حساب دینے کے تصور کی بجائے پرویز صاحب وائیٹ ہیڈ کی اس رائے کے مؤیّد ہیں کہ''یوم الحساب تو ہر آن ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے۔''[۳۶]

نظریۂ ارتقاء اور قصۂ آدم

تمام الہامی کتابوں کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام وہ پہلے انسان اور پیغمبر ہیں جنہیں خدا نے اپنے دستِ قدرت سے الگ اور مستقل مخلوق کے طور پر تخلیق فرمایا اور اس کے بعد دنیا کے سارے انسان انہی سے پیدا ہوئے، لیکن مغرب میں نیچریت اور مادیت پر مبنی تصورِ ارتقاء کے پیشِ نظر مذکورہ مذہبی تصور کو غلط ٹھہراتے ہوئے انسان کے ارتقائی ظہور کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ انسانی ارتقاء کا نظریہ زیادہ منظّم اور مدلّل انداز میں

چارلس ڈارون کی ۱۸۵۹ء میں شائع ہونے والی شہرہ آفاق کتاب 'اصل الانواع' (Origin of Species) میں سامنے آیا۔اس نظریہ کی رؤ سے انسان لاکھوں برس پہلے کیڑے کی شکل میں رینگتی ہوئی زندگی سے انتخابِ طبیعی(Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے اصولوں کے تحت مرحلہ وار ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل میں نمودار ہوا ہے۔ابتدائے حیات ،تسلسلِ حیات ،تدریج وارتقاء اور کاروبارِ کائنات کے لیے کسی خدا کی ضرورت نہیں ۳۷؎ بلکہ یہ سب کچھ خود بہ خود میکانکی انداز میں ہوتا جاتا ہے۔نظریۂ ارتقاء اگر چہ سائنسی دلائل کے لحاظ سے انتہائی کم زور تھا۔۳۸؎ تاہم اسے اس کی مذہب بیزاری کی بنا پر قبولیتِ عامہ حاصل ہوگئی اور پروفیسر ایم۔اے۔قاضی کے بہ قول کمیونسٹ اور غیر مذہبی رجحانات کے حامل افراد اور روایتی دینی تصورات سے برسرِ جنگ سائنس دانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔۳۹؎

پرویز صاحب نے انسانی ارتقاء کے ڈاروینی نظریے کو قبول کرتے ہوئے حضرت آدم اور ان کی تخلیق سے متعلق آیات کی تشریح اسی زاویے سے کی ہے۔ان کے نزدیک تخلیق انسانی سے متعلق قرآنی اشارات ہماری فکر کا رخ نظریۂ ارتقاء کی طرف ہی موڑتے ہیں۔انہوں نے متعدد مقامات پر نظریۂ ارتقاء کے ثبوت میں قرآنی آیات سے استدلال کی کوشش کی ہے۔ایک جگہ ڈارون کے تصور ارتقاء کو تائیداً نقل کرتے ہوئے لکھا ہے: ''حیات کے جرثومۂ اولین (protoplasm) کی ابتداء سمندر میں ہوئی تھی، کیونکہ اس میں اسی نوعیت اور تناسب کے نمکیات (Salts) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔سمندر کا پانی جب اپنے کنارے کی مٹی سے ملا تو اس سے وہ پہلا (Cell) خلیہ وجود میں آ گیا جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔اس خلیہ میں ہنوز نر ومادہ کی تمیز نہیں ہوئی تھی۔اس لیے اسے سائنس کی اصطلاح میں (Unicellular organism) کہتے ہیں۔قرآن اسے 'نفسِ واحدۂ' کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ ارتقاء شروع ہوا۔نفس واحدہ جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا، جن میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار کر لی اور دوسرے نے مادہ کی اور یوں زندگی کے

پیکروں کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے مختلف شاخوں میں پھیل گیا۔ ان میں سے ایک شاخ نوعِ حیوانات کی ہے۔ اسی سلسلۂ ارتقاء نے ایک قدم آگے بڑھایا تو زندگی نے انسانی پیکر اختیار کر لیا۔''[۴۰]

ایک جگہ ڈارون سے گہرا تاثر ان کی اس تعبیر سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ ڈارون کی کتاب 'اصل الانواع' (Origin of Species) کو قرآنی الفاظ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (الانعام:۳۸) کی شارح قرار دیتے ہیں۔[۴۱] ڈارونیت پر اعتقاد پرویز صاحب کی تعبیراتِ قرآنی میں آدمؑ کے شخصی وجود سے انکار اور شرف انسانی سے گریز پر منتج ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات نہیں۔[۴۲] آدم سے کوئی خاص انسان یا بشر مراد نہیں اور قصۂ آدم خود نوع انسانی کی سرگذشت ہے۔[۴۳]

آدم اور تخلیق انسانی سے متعلق قرآنی بیانات پر غور کریں تو پرویز صاحب کی مذکورہ تعبیرات واضح طور پر غلط معلوم ہوتی ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (آل عمران:۵۹) جیسی آیات قطعیت کے ساتھ حضرت آدمؑ کا شخصی وجود اور انسان کا ایک الگ مخلوق کے طور پر پیدا کیا جانا ثابت کر رہی ہیں، جب کہ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل:۷۰) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ (التین:۴) جیسی آیات بالبداہت شرف انسانی پر دلالت کرتی ہیں۔

معجزات

معجزات تمام مذاہب اور کتبِ سماوی کا ایک اہم عنصر اور ناقابلِ رد حصہ رہے ہیں۔[۴۴] از روئے قران وحدیث معجزات کا حق ہونا اتنا بدیہی ہے کہ تمام ائمہ محققین نے اس پر اتفاق کیا ہے۔[۴۵] فلاسفہ اور سائنس دانوں کی ایک کثیر تعداد بھی معجزات کے امکان ووقوع کو تسلیم کرتی ہے۔[۴۶] لیکن یورپ میں علمی نشأۃ ثانیہ کے ساتھ عقلیت پرستی کی جو تحریک اٹھی، اس کے نتیجے میں یورپ میں یہ تصور جڑ پکڑ گیا کہ یہ کائنات جانے بوجھے قوانین فطرت کے مطابق چل رہی ہے۔ لہٰذا معلوم ومعروف قوانینِ فطرت سے

ہٹ کر کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر ایمان رکھنا عقل وعلم سے بیر اور جہالت و وہم پرستی ہے۔۴۷ بائبل کا دفاع کرنے والوں کی طرف سے بائبل میں مذکور معجزانہ واقعات کو تمثیلات سے تعبیر کرنے کے ساتھ یہ موقف بھی اختیار کیا گیا کہ بائبل میں یہ واقعات بعد کے زمانوں میں در آئے، مسیح کی تعلیم تو محض اخلاقیات سے متعلق تھی، جس میں معجزات کا کوئی دخل نہ تھا۔۴۸ اسلام سے متعلق بھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن میں معجزات کا کہیں ذکر نہیں ہے، پیغمبر اسلام نے کبھی معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا، لہٰذا آپ کی اور دیگر انبیاء کی طرف منسوب معجزات، جو قرآن میں مذکور بتائے جاتے ہیں، غلط ہیں۔۴۹

پرویز صاحب نے بھی منکر معجزات مغربی اہل قلم سے متاثر ہو کر معجزات کو مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''معجزہ چوں کہ قانون فطرت کے خلاف ہے اور قرآن کی رو سے کوئی واقعہ خلافِ قانونِ فطرت رؤنما نہیں ہوسکتا، بنا بریں معجزات کا وجود بروئے قرآن غلط ہے''۔۵۰ وہ قرآن میں مذکور معجزاتی نوعیت کے واقعات کو عام قوانین فطرت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے وہ انہیں تمثیلات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا مغربی مصنفین سے شدید تاثر بالکل نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر معجزات مسیح کے تمثیلی ہونے کی ایک بڑی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ ایک نامور عیسائی عالم (Michael Grant) نے اپنی کتاب (Jesus: An Historians Review of the Gospel) میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خود حضرت عیسیٰؑ ان کو تمثیلات واستعارات سمجھتے تھے۔ ۵۱ چنانچہ آیت قرآنی وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِیءُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْمِنِیْنَ۔ (آل عمران:۴۹) کا مفہوم بیان کرتے ہوئے گرانٹ ہی کی طرح معجزاتِ مسیح کو تمثیلات واستعارات ثابت کرنے کے لیے انھوں نے نہایت دور از کار تاویلات سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''عیسیٰ اس قوم سے، جس کے عروقِ مردہ میں زندگی کی حرارت

باقی نہیں رہی، کہے گا کہ میں تمہارے نشو ونما دینے والے کی طرف سے زندگی بخش پیغام لے کر آیا ہوں ۔ میں اس وحی کے ذریعے تمہیں ایسی حیاتِ نو عطا کر دوں گا جس سے تم اپنی موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں اُڑنے کے قابل ہوجاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر وعمل کی رفعتیں نصیب ہو جائیں گی ۔ یہ آسمانی روشنی تمہاری بے نور آنکھوں کو ایسی بصیرت عطا کر دے گی جس سے تم زندگی کے صحیح راستے پر چلنے کے قابل ہو جاؤ گے ۔اس سے تمہاری قوم کی ویران کھیتی، جس پر تر وتازگی کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، پھر سے سرسبز وشاداب ہو جائے گی، تمہاری وہ کمینہ خصلتیں دور ہو جائیں گی، جن کی وجہ سے تمہیں کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔مختصراً یہ کہ ذلّت وخواری کی وہ موت، جو اس وقت تم پر چاروں طرف سے چھا رہی ہے، ایک نئی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔ میں تمہارے موجودہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ ایسا نظام قائم کروں گا جو اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ تم کھانے پینے کی چیزوں میں سے کس قدر اپنے مصرف میں لاتے ہو اور کس قدر ذخیرہ (Hoarding) کرتے ہو کہ اس سے ناجائز نفع کمایا جائے ۔اس قانون میں تمہارے لیے بازآفرینی (ایک نئی زندگی حاصل کر لینے) کی بہت بڑی نشانی ہے، بشرطے کہ تم اس کی صداقت پر یقین کرو۔''۵۲ حضورﷺ کے حوالے سے مغربی اہل فکر کے تتبع میں پرویز صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ آپؐ نے کوئی معجزہ دکھایا، نہ دکھانے کا دعوی کیا۔لوگوں کے معجزات کے مطالبات کا جواب آپ کی طرف سے ہمیشہ انکار میں دیا جاتا رہا۔۵۳

حدیث اور اس کی حفاظت وحجّیت

حدیثِ نبوی کلام اللہ کی تشریح وتفسیر ہے۔اس کے بغیر قرآن کا صحیح فہم محال ہے۔اسلام میں حدیث کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر علماءِ دین نے اس کی حفاظت و تدوین کے سلسلہ میں بے مثال محنت و کاوش سے کام لیا۔محققین نے نہایت قوی اور ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ احادیث نبوی کو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں لکھنے لکھانے، محفوظ رکھنے اور آگے منتقل کرنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔محدثین نے

انھیں انتہائی احتیاط سے جمع ومدوّن کیا۔ ان کی جانچ پرکھ، اعلیٰ ترین سائنسی معیارات کے تحت ہوئی ہے۔ بنابریں مستند احادیث کی صحت کو چیلنج کرنا اس سائنسی معیار پر پرکھی ہوئی سچائی کو جھٹلانا ہے۔۵۴ لیکن مستشرقینِ یورپ اسلامی قانون کے اس ماخذِ ثانی کو مشکوک ومشتبہ بنانے کے لیے اس پر نہایت زور شور سے حملہ آور ہوئے ہیں۔ حدیثِ نبوی پر اعتراضات کے معاملہ میں مستشرقین کا سرخیل مشہور یہودی مستشرق گولڈ زیہر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ احادیث اسلام کے عہدِ طفولیت کی تاریخ کے لیے قابل اعتبار ماخذ نہیں ہیں۔ یہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں اسلام کے دینی، تاریخی اور اجتماعی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔۵۵ گولڈ زیہر نے اموی حکم رانوں اور علمائے صالحین (جن میں حدیث کے عظیم امام زہریؒ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں) پر اپنے مقاصد کے لیے حدیثیں وضع کرنے کا الزام عائد کیا۔ ۵۶ اس کے نزدیک اولین راویانِ حدیث بھی حدیث کے سلسلہ میں غیر دیانت دارانہ اور خود غرضانہ محرکات سے آزاد نہ تھے، اور اپنی ذاتی اغراض کو بلا جھجک بطورِ حدیث پیش کر دیا کرتے تھے۔۵۷ گولڈ زیہر کے بعد حدیث سے متعلق سامنے آنے والے استشراقی خیالات، بقول ڈاکٹر فواد سیزگین، گولڈ زیہر ہی کے افکار کی صدائے بازگشت ہیں۔۵۸ اے گیوم نے اپنی کتاب (The Traditions of Islam) میں جگہ جگہ گولڈ زیہر کے خیالات کو دہرایا ہے۔۵۹ جوزف شاخت۶۰، چارلس آدم ۶۱ اور آرتھر جیفری ۶۲ وغیرہ نے بھی گولڈ زیہر کی فراہم کردہ بنیادوں پر ہی حدیث پر اپنے اعتراضات کی عمارت کھڑی کی ہے۔

حدیث کے سلسلے میں پرویز صاحب کے خیالات محض مستشرقین کے خیالات کا چربہ ہیں۔ انہوں نے احادیث کی حجیت اور محفوظیت کا انکار کیا اور اس ضمن میں بدیہی طور پر استشراقی طرزِ استدلال اپنایا ہے۔ ان کے مطابق ''حدیث تیسری صدی میں ایرانی جامعینِ حدیث کے ذریعہ سامنے آنے والی ایک عجمی سازش ہے۔ احادیث کی اگر دین میں کوئی حیثیت ہوتی یا یہ حجت اور ماخذ دین ہوتیں تو حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ ان کی حفاظت اور نشر واشاعت کا اہتمام کرتے، لیکن آپؐ اور صحابۂ کرام نے نہ صرف یہ کہ

احادیث کی حفاظت سے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا، بلکہ الٹا ان کو لکھنے لکھانے سے منع کیا۔ آج احادیث کے نام سے ہمیں جو کچھ ملتا ہے یہ محض مسلمانوں میں مرّوج باتیں تھیں جن کو غلط طور پر حضور کی جانب منسوب کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں امام بخاریؒ اور دیگر حضرات نے ان باتوں کو جمع کر کے کتبِ احادیث کی شکل دے دی اور یوں صدیوں بعد مرتّب ہونے والے یہ مجموعے مسلمانوں میں احادیثِ رسول کے نام سے رائج ہو گئے، حالاں کہ انہیں خدا اور رسول کی کوئی سند حاصل نہ تھی''۔[۶۳]

اشتراکیت اور نظامِ ربوبیت

سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و استحصال کے ردِّ عمل کے طور پر کارل مارکس (۱۸۱۸ء-۱۸۸۳ء) کے ذریعہ اشتراکی تصور یا مارکسزم سامنے آیا۔ مارکسزم کا مقصدِ وحید کارل مارکس کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی وانفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے۔ ملکیت مشترکہ ہو، وسائلِ پیداوار کو مجتمع کر لیا جائے، سرمایہ داروں کے املاک وخزائن کو تدریجاً قبضے میں لے کر تمام وسائل و ذرائع مزدوروں کی جماعت کی حکومت کے ہاتھ میں مرکوز کر دیئے جائیں''۔[۶۴] سرمایہ دارانہ اور اشتراکی ہر دو نظام دو انتہاؤں سے عبارت اور افراط وتفریط کے پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اسلام کے اصولوں اور ہدایات کی روشنی میں معیشت کا جو نقش ابھرتا ہے وہ ان دونوں نظاموں کی خامیوں سے پاک اور اقتصادیات کے باب میں انسان کی ترقی وکامرانی کا ضامن ہے۔ لیکن پرویز صاحب نے مارکسی فکر سے متاثر ہو کر اسلام کو اشتراکیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ انہوں نے قرآنی نظامِ ربوبیت کا فلسفہ تراشا اور معیشت کے مسئلے کا حل مارکسی فکر میں پنہاں بتایا۔[۶۵] اس سلسلہ میں مارکسزم کے علم برداروں سے ان کے تاثر کی حد یہ ہے کہ وہ مذہب سے نالاں اور اس مذہبی تصور سے برسرِ جنگ دکھائی دیتے ہیں جس کی رؤ سے رزق کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ کارل مارکس کا جانشین لینن مذہب کو لوگوں کے لیے افیون قرار دیتا تھا۔ چنانچہ نظریۂ مارکس کی رؤ سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلۂ کار ہیں، جن کے توسط سے مزدور طبقہ کے حقوق کو

پامال کیا جاتا ہے اور انہیں فریب دیا جاتا ہے، لہٰذا مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا ہراشتراکی کے لیے ضروری ہے، تاکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔[۶۶] پرویز صاحب کا کہنا ہے کہ ''رزق کا معاملہ خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا، بلکہ یہ مذہبی پیشوائیت کی فریب کاری ہے، جو عوام کو اس غلط عقیدہ کی افیون دے کر نظامِ سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط کرتی رہتی ہے۔ صاحبِ اقتدار گروہ وسائلِ پیداوار اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے اور پھر دوسرے انسانوں کو روٹی کا محتاج بنا کر ان سے اپنا ہر حکم منواتا ہے۔ جب بھوکے انسان اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو مذہبی پیشوائیت انہیں یہ کہہ کر سلا دیتی ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے امیر بنا دیتا ہے، جسے چاہتا ہے غریب رکھتا ہے، جسے چاہتا رزقِ فراوان عطا کر دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بھوکا رکھتا ہے، کوئی انسان اس فرق کو مٹا نہیں سکتا''۔[۶۷]

عقوبات

اسلام نے اپنی تعلیمات میں انسانی سوسائٹی کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے جرم وسزا کا ایک واضح فلسفہ اور مختلف جرائم کی نوعیت اور مضرت رسانی کی ٹھیک ٹھیک تعیین کے بعد انتہائی موزوں اور مناسب حال سزاؤں کا تصور پیش کیا ہے لیکن مستشرقین نے اسلامی سزاؤں کو بے جا ہدفِ تنقید بناتے ہوئے انہیں نا قابلِ برداشت حد تک سخت ظاہر کرنے کی سعی کی۔[۶۸] تجدد پسند مسلمانوں نے اہلِ مغرب کی تنقید سے گھبرا کر عقوبات کے ضمن میں وارد اسلامی احکام کی تعبیر اس انداز سے کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی سزائیں نرم سے نرم تر نظر آئیں۔ پرویز صاحب ان تجدد پسندوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نہایت دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ اسلامی سزاؤں کو نرم ظاہر کرنے کے لیے بلا تکلف احادیث اور تاریخی وفقہی روایات سے استشہاد کرتے ہیں، حالاں کہ دیگر مباحث میں وہ ان چیزوں کو مستند اور قابلِ اعتبار ہی نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر سزائے زنا کی بحث میں اس سزا کو معمولی اور نرم ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے روایات اور فقہ سے استشہاد کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہدِ نبوی اور

عہد صحابہ میں کوڑوں کی سزا بہت نرم ہوتی تھی۔ لہٰذا ایسی کوئی سزا جائز نہ ہوگی جس سے مجرم کی کھال یا گوشت کو نقصان پہنچے۔ مزید برآں انہوں نے سعودی عرب میں کوڑوں کی سزا کی نرمی کے واقعات کے تذکرہ کے ذریعہ بھی اس سزا کو نہایت معمولی باور کرانے کی سعی کی ہے۔[۶۹] حد سرقہ کے ضمن میں بھی انہوں نے روایات اور فقہ کی کتابوں سے دلائل پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ایک انتہائی سزا ہے جس کے عملی اطلاق کا موقع قریب قریب ناممکن ہے اور قطع ید سے مراد درحقیقت ایسا طریق اختیار کرنا ہے کہ چور چوری سے باز آجائیں۔[۷۰]

تعدّدِ ازواج

تعدّدِ ازواج ایک مرد کے لیے ایک وقت میں مخصوص شرائط کے ساتھ چار تک شادیاں کرنے کی اجازت پر مبنی قانون ہے، جو انسان کے خالق نے اپنی حکمتِ بالغہ سے، انسان کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر قائم کیا ہے۔ مستشرقین نے اس قانون کو غلط رنگ میں پیش کر کے مسلمانوں کو اپنے دین سے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ محمد خلیفہ کے مطابق تعددِ ازواج اسلام کے ذیل میں مستشرقین کے ان بڑے اہداف میں سے ایک ہے، جن کے بارے میں مغرب میں خصوصیت کے ساتھ غلط فہمیاں پھیلائی گئیں۔ اے تجدد پسند مسلم مصنفین مستشرقین سے متاثر ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ اسلام نے دراصل تعدد ازواج کو عملاً ختم کر دیا ہے۔ پرویز صاحب نے بھی تعدد ازواج کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہی ثابت کرنا چاہا ہے۔ وہ تعدد ازواج کو ایسی شرائط سے مشروط کرتے ہیں جن سے یہ ناممکن العمل ہو کر رہ جاتا ہے۔[۷۲] ان کے مطابق قرآن نے دراصل ایک وقت میں ایک ہی بیوی کا اصول مقرر کیا ہے۔ اگر کسی وقت بیوی سے نباہ کی صورت نہ رہے تو قرآن کی رؤ سے اس کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت نہیں، ہاں البتہ اس کی جگہ دوسری بیوی لائی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (النساء:۲۰) کا مفہوم یہ ہے کہ ''اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو تو اس کے لیے پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کرو۔''[۷۳]

نتیجۂ بحث

اوپر کی بحث اس حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اسلامی امور سے متعلق غلام احمد پرویز کے تصورات پر مغربی فکر کے گہرے سائے ہیں۔ وہ بیش تر معاملات میں اہل مغرب کے نتائجِ فکر کو معیارِ حق مان کر قرآنی آیات کے مفاد و مقصود کو ان سے ہم آہنگ باور کرانے کے درپے نظر آتے ہیں۔ وہ جدید افکار و نظریات سے تطبیق کی خاطر قرآنی اصطلاحات کو انتہائی بے جا معانی پہناتے اور بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کی تعبیراتِ قرآنی کا مطالعہ کرنے والا قرآن کو کتابِ مبین کے بجائے ایسی کتاب محسوس کرتا ہے جو پہیلیوں کی زبان بولتی اور پیچ در پیچ گفتگو کرتی ہے۔ انتہائی دور از کار تاویلات کی بنا پر ان کی تفسیری نگارشات صاحبانِ علم و تحقیق کے ہاں بار پانے میں ناکام رہیں۔ راسخ العقیدہ علماء کو تو پرویز صاحب پر برہم ہونا ہی تھا کہ ان کی تعبیرات سے اسلام کے اساسی تصورات پر بہت جارحانہ زد پڑتی تھی، خود جدت پسند اہل علم و فکر نے بھی انہیں قبول نہ کیا۔ اگر راسخ العقیدہ علماء کی جانب سے ان کو مرتد قرار دیے جانے کو صحیح نہ بھی قرار دیا جائے اور جدیدیت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی علمی میدان میں وہ با مراد نہیں ٹھہرتے کہ انہوں نے جدّت پسندی کو بھی مجروح کر ڈالا۔

حواشی و مراجع

۱۔ غلام احمد پرویز، مطالب الفرقان، طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۰۰ء، جلد اول، ص ع

۲- غلام احمد پرویز، شعلۂ مستور، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۸۹۔۹۰

۳- مطالب الفرقان، جلد اول، ص ع۔ غ

۴- غلام احمد پرویز، تبویب القرآن، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۷

۵- غلام احمد پرویز، مفہوم القرآن، میزان پبلیکیشنز، لاہور، (س۔ن) جلد اول، ص د

۶- مطالب الفرقان، جلد اول، ص غ

۷- ایضاً ۸- ایضاً

۹- شعلۂ مستور، ص ۸۹

۱۰- عبدالرحمان طاہر، ابن مریم اور پرویز، مکتبہ علمیہ، لاہور، بارِ اول، ص ۲۸

۱۱- غلام احمد پرویز، انسان نے کیا سوچا، طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۵-۱۶

۱۲- عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، مترجم ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲۲-۳۳۲

۱۳- جاوید احمد غامدی، پرویز صاحب کا فہمِ قرآن، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۷

۱۴- جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۸-۱۶۰۔

۱۵- Longman,Green & co;Pub.by,Supernatural Relegion, London, 1874,Vol.II.p.480.

۱۶- مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص ۱۲

۱۷- مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۸۸

۱۸- غلام احمد پرویز، سلیم کے نام، جلد اول، ص ۲۹۹

۱۹- مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۳۵-۳۶

۲۰- غلام احمد پرویز، نظامِ ربوبیت، ادارہ طلوعِ اسلام، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۶۱

۲۱- Muhammad Asad,Islam at the Cross Roads,Lahore,Arfat Publications,1955,pp128-120.

۲۲- مطالب الفرقان، جلد چہارم، ۱۹۸۱ء، ص ۳۸۴ ۲۳- ایضاً

۲۴- مطالب الفرقان، جلد چہارم، ۱۹۸۱ء، ص ۳۳۶-۳۳۷

۲۵- غلام احمد پرویز، شاہ کارِ رسالت، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۸۱

۲۶- The Encyclopedia of Religion, Mircea Eliade, Editor in Chief, London & New York,1987,Vol.4.p.291.

۲۷- مطالب الفرقان، جلد دوم، ۱۹۹۶ء، ص ۶۷-۷۰

۲۸- مطالب الفرقان، جلد دوم، ص ۵۰-۵۲

۲۹- ایضاً، ص ۴۱-۴۲

۳۰- Vide,The Encyclopaedia Britannica, Chicago, 1986, Vol.5,p.789,The Ency clopedia of Religion, Op.Cit., Vol.1, p.286.

۳۱۔ Vide, Bell, Richard, Introduction to the Quran, Edinburgh University press,1963, pp.156-161.

۳۲۔ Vide,Muir, William, The Life of Mahomet, London, Smith Elder& Co; 1877, Vol.2. pp141-145.

۳۳۔ مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۳۲۷-۳۲۸

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۳۳-۳۳۴ ۳۵۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۳۶۔ انسان نے کیا سوچا؟ ص ۴۰۴

۳۷۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے وضاحت کی ہے کہ ڈارون نے کتبِ مقدسہ کے نظریۂ تخلیق انسانی اور اس سلسلہ میں خدا تعالیٰ کی کارفرمائی کے تصور کا خصوصیت کے ساتھ انکار کیا ہے۔ (The Encyclopaedia Britannica, Op.Cit,Vol.18,pp.996-997)

۳۸۔ سائنسی اعتبار سے اس نظریہ کی کم زوری اس حقیقت سے بھی عیاں ہے کہ اس کے پُر جوش متبعین اپنی جاں گسل کاوشوں کے باوصف اسے آج تک حتمی طور پر ثابت نہیں کر سکے۔ معروف ماہر حیاتیات ڈاکٹر ہلوک نور باقی نے حیاتیات کے معروف ماہر اور نظریۂ ارتقاء کے پر جوش حامی آر۔ بی۔ گولڈ شمڈٹ (R. B. Gold Shemidt) کے حوالے سے لکھا ہے کہ نظریۂ ارتقاء کے ثبوت میں آج تک ایک بھی شک وشبہ سے بالاتر سائنسی شہادت میسر نہیں آ سکی ۔ڈاکٹر صاحب کے مطابق جدید سائنس دان دواں گش (Duan Gish) کے نزدیک انسان کا جانور سے ارتقاء پذیر ہونا محض ایک فلسفیانہ تخیل ہے، جس کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں۔ ڈاکٹر باقی نے پر زور سائنسی دلائل کی بنا پر ڈارونزم کی زبردست تردید کی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف میں نظریۂ ارتقاء کے خلاف بہت سی معتبر سائنسی شہادتیں پیش کی ہیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ہلوک نور باقی، قرآنی آیات اور سائنسی حقائق، مترجم، سید محمد فیروز شاہ گیلانی، انڈس پبلشنگ کارپوریشن، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۵۔۱۹۵

۳۹۔ Kazi, M.A,Quranic Concepts and Scientific Theories, Jordan, Amman,Islamic Academy of Sciences, 1999, pp.28-29.

۴۰۔ مطالب الفرقان، جلد دوم، ص ۵-۶

۴۱۔ مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص ۲۵-۲۶

۴۲۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۴۱ ۴۳۔ ایضاً، ص ۶۲

۴۴۔ عیسائیت میں معجزات، خود مغربی اہلِ فکر کے اقرار کے مطابق، اس قدر ضروری عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اس مذہب سے معجزات کو نکالنا، مذہب کو باطل قرار دینے کے مترادف ہے۔ (Supernatural Religion, Op.Cit, Vol.I. pp.9-10.)

۴۵۔ See for detail; Bashir Ahmad Siddiqi,Dr, Modern trends in Tafsir Literature-Miracles, Lahore, Faculty of Islamic University of the Punjab, and Oriental Learning, 1988, pp.139-182

۴۶۔ حوالہ سابق، ص ۲۲۱-۲۳۵

۴۷۔ Supernatural Religion, Op.Cit, Vol.II.p.480.

۴۸۔ حوالہ سابق، ص ۴۸۶

۴۹۔ Bashir Ahmad Siddiqi,Dr, Modern trends in Tafsir Literature-Miracles, Op.Cit, p.8.Cf Shorter Encyclopedia of Islam,article, "Mujiza"

۵۰۔ مطالب الفرقان، جلد چہارم، ص ۹۳

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۴ ۵۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲-۱۱۳

۵۳۔ مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۳۰۹

۵۴۔ حدیث کی حجیت و اہمیت اور صحت و حفاظت سے متعلق محققین کے قوی و محکم تفصیلی دلائل کے لیے ملاحظہ ہو: محمد بن علوی المالکی الحسنی، المنہل اللطیف فی اصول الحدیث الشریف، دارالفکر بیروت، ۱۹۷۸ء، ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب، السنۃ قبل التدوین، دارالفکر، بیروت، ۱۹۸۰ء، محمد مصطفیٰ سباعی، السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی، مکتبہ دارالعروبۃ، القاہرۃ، ۱۹۶۱ء، ڈاکٹر حمید اللہ، خطباتِ بہاول پور، ادارۂ

تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ڈاکٹر محمود احمد غازی، محاضراتِ حدیث، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۴ء، Muhammad Mustafa Azmi,Studies in Hadith early Literature,Lahore,Suhail Academy,2001.

۵۵۔ Goldziher, Ignaz, Muslim Studies, translated by C.R.Barber & S. M. Stern. Chicago, IL! Aldine Publishing, 1973, Vol. II.p.18.

۵۶۔ Ibid.p.44. ۵۷۔ Ibid.p.56.

۵۸۔ فواد سیزگین، مقدمہ تاریخ تدوین حدیث، مترجم، سعید احمد، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸

۵۹۔ See for example; Guillume, Alfred, The Traditions of Islam, Beirut, Khayats, 1966, pp.15, 47-50,60,78.

۶۰۔ Shacht,.J,The Origins of Muhammadan Jurisprudence, Oxford,1950, Idem,Islamic Law,Oxford,1964,p.34.

۶۱۔ The Encyclopedia Americana, Grolier incorporated, 1984, Vol.15,p494.

۶۲۔ Jeffery,Arther,Islam Muhammad and his Religion, Indiana polus,1979,p.12.

۶۳۔ مطالب الفرقان، جلد چہارم، ص ۳۴۳-۳۵۳

۶۴۔ شوکت علی گیلانی، سوشلزم اور اسلام، انصاری کتاب گھر، کراچی، ۱۹۴۹ء، ص ۳۹-۴۱

۶۵۔ مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۱۱۵-۱۱۶-۱۳۲

۶۶۔ سوشلزم اور اسلام، ص ۴۳ ۶۷۔ مطالب الفرقان، جلد اول، ص ۱۰۷

۶۸۔ See for example; Coulson, N.J, Conflicts and tentions in Islamic Jurisprudence, London, The University of Chicago York, The free press, press, N.D.p.78. Encyclopedia of Crime and Justice, New 1983,Vol. 1, p. 194

۶۹۔ مطالب الفرقان، جلد چہارم، ص ۳۰۰-۳۰۲

۷۰۔ ایضاً، ص ۵۰۳۔۵۱۰

۷۱۔ Muhammad Khalifa,The Sublime Quran and Orientalism ,London $ New York,Longman, 1983,p178.

۷۲۔ مطالب الفرقان، جلد سوم، ص ۳۴۸

۷۳۔ مطالب الفرقان، جلد سوم، ص ۳۴۶

☆☆☆

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

۶۔ ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔ مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

۲- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)

سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ

۳۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)

شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۴۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)

الریحان، مزمل منزل کمپلکس، علی گڑھ

۵۔ مولانا محمد فاروق خاں (رکن)

۱۳۵۳- بازار چتلی قبر، دہلی-۶

۶۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی (رکن)

فریدی ہاؤس، سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

۷۔ مولانا مطیع اللہ کوثر یزدانی (رکن)

ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، ۲۵

۸۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)

مالاتھن کنڈی ہاؤس، یلیری، کالی کٹ

۹۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)

طارق منزل، بریا توہاؤسنگ کالونی، رانچی

۱۰۔ جناب محمد جعفر (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

۱۱۔ انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)

لکا سا اپارٹمنٹس، بنجارہ ہلس، حیدرآباد

مندرجہ بالا معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری - ذمّی

——— مولانا یحییٰ نعمانی

اسلام کے جو پہلو موجودہ دور میں مخالفینِ اسلام کی تنقیدوں اور اعتراضات کا زبردست ہدف بنے ہیں، ان میں اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں کی حیثیت اور حقوق، اسلام کا تصور جہاد، جزیہ کی حقیقت اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مدیر مجلّہ مولانا سید جلال الدین عمری نے اپنی وقیع تصنیف 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق' میں ان موضوعات پر مفصّل اور مدلّل بحث کی ہے اور ان اعتراضات کا بھرپور جواب دیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں بھی 'ذمّیوں کے حقوق' پر مختلف پہلوؤں سے اچھی بحث کی گئی ہے۔ (معاون مدیر)

اسلامی شریعت کی قانونی اصطلاح میں اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے لیے 'اہل ذمہ' یا 'ذمّی' کے الفاظ بولے گئے ہیں۔ 'ذمہ' کے معنی گارنٹی اور ذمہ داری کے ہیں۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کے حقوق اور تحفظ کی ذمہ داری حکومت پر لازم ہوتی ہے۔

اسلامی شریعت میں شہریت کی بنیاد ایک معاہدہ تصور کیا جاتا ہے۔ گویا ہر شہری ریاست اور معاشرے کے ساتھ معاہدہ میں مربوط ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کو حقوق بھی ملتے ہیں اور اس پر ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کے معاہدہ میں عام انسانی حقوق وفرائض اور اجتماعی ذمہ داریوں کے علاوہ خالص دینی ذمہ داریاں بھی شامل ہوتی ہیں، لیکن ایک غیر مسلم شخص جب اسلامی ریاست کا شہری ہوتا ہے تو اس کے ساتھ معاہدہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ 'ذمہ' اور 'ذمی' کی اصطلاح صاف بتاتی ہے کہ ریاست اور معاشرہ ان لوگوں کے حقوق کی ذمہ داری لے رہے ہیں اور ریاست کی نظر میں غیر مسلم 'محکوم باج گذار' نہیں، بلکہ ایسے شہری ہیں جن کے حقوق کے سلسلے میں ریاست اپنی

مسئولیت اور ذمہ داری کا بھرپور احساس رکھتی ہے۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے ذرا پہلے اپنے بعد کے خلیفہ کے لئے جو وصیتیں کی تھیں ان میں ریاست کے لئے نہایت قدر واحترام کے لائق 'مہاجرین اولین' اور انصار کی حق شناسی کی نصیحت کے بعد یہ بھی فرمایا تھا:

وأوصيه بذمة الله وذمة رسوله، أن يوفّى لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم، وأن لا يكلّفوا فوق طاقتهم۔[1]	میں وصیت کرتا ہوں اللہ ورسول کے ذمہ کا خیال رکھنے کی، ان سے کیے گئے معاہدے کو پورا کیا جائے، ان پر کوئی حملہ آور ہو تو ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے اور ان کی سکت سے زیادہ ان پر ٹیکس نہ لگایا جائے۔

اس وصیت میں اہل ذمہ کے حقوق کو 'ذمة الله وذمة رسوله' (اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ) کہہ کر جو تقدس اور احترام بخشا گیا ہے اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اہل ذمہ کے ان حقوق میں وہ سارے شہری حقوق آجاتے ہیں جو کسی بھی عادلانہ نظام حکومت میں اس کے شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً:

۱- غیر مسلم شہریوں کی جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست پر ہوتی ہے۔ ریاست اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی جان ومال کی بالکل اسی طرح حفاظت کی پابند ہوگی، جیسا کہ وہ مسلم شہریوں کے جان ومال کی حفاظت کرتی ہے۔ فقہ اسلامی کی تمام معتبر کتابوں میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اہل ذمہ کو ہر طرح کی بیرونی اور داخلی جارحیت سے تحفظ فراہم کرے۔[2]

مملکت کے داخلی دائرے میں بھی ان کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ظلم اور ظالم کے لئے جو وعیدیں قرآن وسنت میں آئی ہیں ان سب کا اطلاق اہل ذمہ پر کیے جانے والے ظلم پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم عددی لحاظ یا کسی دوسرے پہلو سے کم زور ہوسکتے ہیں، اس لیے خصوصاً ان پر ظلم کرنے والے کے لیے

رسول اللہ ﷺ نے الگ سے شدید وعیدیں سنائی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ألا من ظلم معاهداً، أو انتقصه أو كلّفه فوق طاقته، أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس فأنا حجيجه يوم القيامة . [۳]

خبردار، جو کسی ذمی پر ظلم کرے، یا اسی کا کوئی حق مارے یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اس سے کام لے یا اس کی مرضی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے لے تو قیامت کے دن میں اس کے خلاف اللہ کی عدالت میں نالش کروں گا۔

ذمی کے قصاص کا مسئلہ

ذمی کی جان اسلام کی نگاہ میں اسی طرح قابل احترام ہے جس طرح کسی مسلم شہری کی۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوش بو تک نہیں پاسکے گا''[۴]۔ لیکن فقہاء وعلماء کی ایک بڑی تعداد اس کی قائل ہے کہ ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کی روایت کردہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ''مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا''۔[۵] البتہ اس کی دیت وصول کی جائے گی۔

دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ، ان کے اصحاب اور دیگر بہت سے فقہاء اس کے قائل ہیں کہ ذمی کے بدلے میں اسی طرح قصاص نافذ ہوگا جس طرح کسی مسلمان مقتول کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کی اصل دلیل یہ ہے کہ مقتولین کے قصاص کے جو احکام قرآن وسنت کے بہت سے نصوص میں آئے ہیں ان میں کہیں ایسی کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ ذمی کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں جائے گا، بلکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قابل احترام جان کا یہی حکم ہے۔ یہ نصوص قرآن میں بھی ہیں اور سنت میں بھی کثرت سے آئے ہیں۔ ان میں علی الاطلاق سارے مقتولین کے قصاص کا حکم آیا ہے اور کہیں ذمی کا استثنا نہیں ہے۔ نیز شریعت کے دیگر احکام میں بھی مسلمان اور ذمی کی جان و مال کا

درجہ قانونی اعتبار سے مساوی نظر آتا ہے۔ دونوں کا قتل حرام ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کا مال چرالے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

دوسری طرف حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث کا سیاق بتاتا ہے کہ روای جس وقت کی گفتگو نقل کر رہا ہے اس وقت حضرت علیؓ کا مقصد اس کے سامنے مکمل حدیث نقل کرنا نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مخصوص ذہنیت کے زیر اثر یہ افواہ اڑائی گئی کہ حضرت علیؓ نے اہل بیت کو کچھ ایسے راز بتائے ہیں جو کسی اور کو نہیں بتائے اور دین کی کچھ تعلیمات صرف انہی کو دی ہیں۔ حضرت علیؓ سے کسی نے اس تعلق سے استفسار کیا تو انہوں نے کہا: نہیں، خدا کی قسم، نہیں۔ ہاں اس صحیفہ میں کچھ احکام ہیں۔ سائل نے پوچھا کہ اس صحیفہ میں کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: دیت کے احکام، قیدیوں کو رہا کرانے کے احکام اور یہ حکم کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔[۶]

روایت کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ حضرت علیؓ نے پوری احادیث اور مکمل احکام نقل کرنے کی نیت نہیں کی تھی، بلکہ وہ صرف اور صرف ان احادیث اور احکام کے عناوین نقل کر رہے تھے اور ان کی طرف اشارے کر رہے تھے جو ان کے صحیفے میں تھے۔ ورنہ پورے صحیفے میں یہ مشکل سے ایک سطر تو نہیں ہوگی جو اس روایت میں نقل کی گئی ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ دوسری روایات میں آں حضرتؐ کا یہ حکم کسی قدر مکمل شکل میں آیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے:

لا یقتل مومن بکافر و لا ذو عھد فی عھدہ[۷]	نہیں قتل کیا جائے گا کوئی مسلمان کسی کافر کے بدلے اور نہ کوئی ذمی ذمی ہوتے ہوئے۔

یہ اس سلسلہ کی نسبۃً مکمل حدیث ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلم یا ذمی کسی کافر (یعنی دارالحرب کے کافر) کے بدلے قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ جس کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا گیا آگے حدیث میں اسی کافر کے بدلے ذمی کو بھی قتل نہ کیے جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

بہر حال اس رائے کے حاملین نے حدیث کا یہی مطلب قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک شریعت کے عام احکام سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔[۸]

مصنف عبدالرزاق میں صحیح سند سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ فرمان منقول ہے کہ ذمی کے قتل کی سزا میں قصاص جاری کیا جائے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اس پر عمل ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔[۹]☆

آخر زمانہ میں سلطنت عثمانیہ نے صدیوں اسی قانون پر عمل کیا۔

ذمی کے مال کی حفاظت

شریعت نے اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ اپنے غیر مسلم شہریوں کے مال کا تحفظ، ان کے مفتوح ہونے کی وجہ سے ترجیحی بنیاد پر کرے۔ حضرت عمرؓ نے فتح شام کے موقع پر اس کی عیسائی آبادی کے سلسلہ میں اپنے گورنر فاتحِ شام حضرت ابوعبیدہؓ کو خط میں لکھا کہ: ''خبردار، مسلمان ذمیوں پر ظلم نہ کرنے پائیں، اور ان کا مال ناجائز نہ ہڑپ کیا جائے''۔[۱۰] مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اسی قانون پر عمل ہوتا آیا ہے۔

حکومتی امداد واعانت

شریعت نے حکومت کو عوام کی بہتر بود و باش کے انتظامات کا ذمہ دار بنایا ہے۔ زمانے کے تمدن کے لحاظ سے حکومت عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی کی ذمہ دار قرار پائے گی۔ ذمی شہری بھی اس سلسلہ میں مسلمانوں کے مثل ہیں۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حیرہ فتح کیا۔ اس کی اطلاع دینے کے لیے انھوں نے مرکز خلافت کو جو خط لکھا اس میں تحریر کیا تھا: ''میں نے ذمیوں کو یہ حق دیا ہے کہ ان میں جو بوڑھا اور بے کار ہو جائے، یا کسی پر کوئی آفت آجائے، یا کوئی مال دار غریب ہو جائے تو اس کا جزیہ (ٹیکس) معاف کر دیا جائے گا، اور اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت

☆ اس مسئلہ میں فقہاء کے اختلاف اور ان کے دلائل کی تفصیل کے لیے دیکھی جائے مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق'، ص ۲۲۲ تا ۲۲۸ (معاون مدیر)

حکومت کے بیت المال سے کی جائے گی''۔[۱۱]

حسن سلوک کی تاکید

رسول اللہ ﷺ نے اہل مصر کے بارے میں وصیت فرمائی تھی کہ جب مصر فتح ہوتو اس کے باشندوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے[۱۲]، ساتھ ہی آپؐ نے اس کو واجب قرار دینے والے دو اسباب کا تذکرہ فرمایا تھا: ایک ذمی ہونے کی حیثیت سے ہم وطنی کا رشتہ، دوسرا یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ننہال مصر میں تھا۔ ظاہر ہے کہ پہلا سبب تو بہرحال ہر ذمی اور مفتوح کو حاصل ہے۔

اہل ذمہ کی مذہبی بیگانگی اور کم زوری کے احساس کا ہی پہلو ہے کہ علامہ ابن عابدینؒ کہتے ہیں کہ ''علماء کے نزدیک ذمی پر ظلم زیادہ بڑا گناہ ہے''۔[۱۳] اسی ذیل میں فقہاء لکھتے ہیں کہ ''مسلمان کو جو حقوق حاصل ہیں وہی ذمی کو بھی حاصل ہیں، یہاں تک کہ اس کی غیبت تک کرنا حرام ہے۔[۱۴]

ترقی کے مساوی امکانات

اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہری کے لئے تجارت وکسب اور ترقی وتعلیم کے مساوی امکانات کا ہونا ضروری ہے۔ فقہاء اسلام نے صراحت کی ہے کہ ان کو اس سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے عہد کی تاریخ ہم کو ان بے شمار اقدامات، اسکیموں اور مہموں کی خبر دیتی ہے جن کا مقصد مفتوح علاقوں اور ان کے باشندوں کی اقتصادی ترقی تھا۔[۱۵]

مذہبی آزادی

مذہبی آزادی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ فطرت انسانی اس حق کو تسلیم کرتی ہے اور جابر معاشروں میں بھی سلیم الفطرت لوگ اس مسلّمہ انسانی حق کو ثابت مانتے آئے ہیں۔ صدر اول میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے غیر مسلم معاشرے میں اسی فطری حق کی بنیاد پر آزادیِ اختیارِ مذہب کا مطالبہ کیا تھا۔ اور قرآن

نے عربوں کے مذہبی جبر اور فتنہ کو ہی وہ عظیم ظلم بتایا تھا جس کی بنیاد پر ان سے جنگ کی جارہی تھی۔

اسی بنیاد پر اسلام ہر زمانے میں دنیا کے ہر معاشرے سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فطری انسانی حق بہر حال محفوظ رہنا چاہئے اور مسلمانوں کو دوسرے تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے اور انھیں باطل ادیان وافکار اور گم راہی پر مبنی طریق زندگی سے روکنے کی کھلی آزادی ہونی چاہئے۔

جب مسلمان دوسری ملتوں اور معاشروں سے اس آزادی کے طلب گار ہیں تو یقیناً انصاف کا تقاضا تھا کہ ان کا دین خود سب سے پہلے اعلان کرتا: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶) ''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں''۔

اسی اصول کے پیش نظر اسلام نے اپنی حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلم شہریوں کی جان ومال، عزّت وآبرو کے علاوہ مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دی ہے۔ان کو اپنے مذہب کے مطابق عقائد رکھنے، عبادت کرنے اور بود و ماند کے طریقے اختیار کرنے کی اجازت دی ہے۔

عبادت گاہوں کا تحفظ

رسول اللہ ﷺ نے نجران کی عیسائی آبادی کو ذمی بنایا اور ان کو ہر طرح کی مذہبی آزادی دی، بلکہ ان کے تحریری معاہدے میں صراحت کی گئی کہ ''ان کے طریقۂ عبادت، ملّی قوانین، مذہبی نظام اور عہدوں اور اوقاف میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی جائے گی''۔[۱۶] بیت المقدس کے عیسائیوں کو حضرت عمرؓ نے جو تحریری امان لکھ کر دی تھی، اس میں جان ومال اور مذہبی مقامات ورسوم، یہاں تک کہ صلیبوں تک کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی۔[۱۷]

کیا اہل ذمہ مسلم ملک میں نئے معابد نہیں بنا سکتے؟

اس ضمن میں ایک اہم مسئلہ ہے جس کی تحقیق کی بھی ضرورت ہے اور اس کو صحیح

طور پر سمجھنے کی بھی۔ اس پر تحقیق اور تدبر کی نظر نہ ڈالنے سے بڑی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ یہ کہ کیا اہل ذمہ مسلم ملک میں نئے معابد نہیں بنا سکتے؟

اس سلسلے میں قرآن وسنت پر وسیع نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس سلسلہ میں کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی رو سے اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا جائے۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت عمرؓ کے زمانے کی فتوحات میں جو لوگ ذمی بنائے گئے ان کو عمومی طور پر اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دی گئی، صرف 'امصار المسلمین' میں ان کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا گیا۔

اس سلسلے میں بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسلامی شریعت کا یہ مستقل قانون ہے کہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر نہ کرنے دی جائے۔ اس سلسلے میں بعض روایتیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن وہ موضوع ہیں اور قرآن وسنت کے عمومی مزاج و ہدایات اور حقیقتِ واقعہ دونوں کے خلاف ہیں۔ ان پر ہم آگے کچھ تفصیل سے کلام کریں گے۔

ابن ابی شیبہ کی المصنف اور ابوعبید کی کتاب الاموال میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے یہ منقول ہے کہ 'امصار المسلمین' میں غیر مسلموں کو عبادت خانے بنانے اور شعائر دینی کے علانیہ اظہار کی اجازت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اور اس جیسی دوسری روایات، جو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غیر مسلموں کو 'امصار المسلمین' میں اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا گیا تھا، ان میں سے کوئی بھی روایت ثابت نہیں ہے۔[۱۸]

لیکن اگر ایسا بہت ہی محدود دائرے میں ہوا بھی تو اس کو غلط طور پر سمجھا گیا۔ اس لیے یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

۱- 'امصار المسلمین' اس زمانے میں مفتوح ملک کی وہ نئی آبادیاں کہلاتی تھیں جنھیں مسلمان اپنی فوجی چھاؤنیوں اور انتظامی مراکز کے طور پر بناتے تھے۔ کوفہ و بصرہ اور

مصر میں خطاط ایسے ہی شہر تھے۔ واضح رہے کہ پورے کے پورے مفتوح علاقے (یعنی عراق سے لے کر شام و مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے) غیر مسلموں کے ہی تھے۔ انہوں نے ایک عرصے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ یہ سارے علاقے وہ تھے جہاں غیر مسلموں کو عبادت گاہوں کی تعمیر اور شعائر دین کے اظہار کی عام اجازت تھی۔[۱۹] افسوس کہ لوگوں نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ 'امصار المسلمین' کا مطلب مسلمانوں کے شہر سمجھا، حالاں کہ یہ خالصۃً ایک اصطلاح تھی، جس کا مطلب صرف وہ شہر تھے جو فتح کے بعد مسلمانوں نے نئے بسائے تھے اور جن کو سیکورٹی اور دیگر وجوہ سے اپنے لیے خاص کر لیا تھا۔ باقی علاقوں کے بارے میں یہ حکم نہیں تھا۔ ہمارے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مفتوح ممالک کی قدیم آبادیوں اور غیر مسلموں کی نئی بستیوں میں ان کو اپنے عبادت خانے قائم کرنے سے نہیں روکا جائے گا، چاہے ان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کیوں نہ آباد ہو۔[۲۰]

حضرت خالد بن الولیدؓ نے شام کے مفتوح علاقے 'عانات' کے لوگوں سے ان دفعات پر مصالحت کی تھی:

على ان لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة وعلى أن يضربوا نواقيسهم في أي ساعة شاؤا من ليل أونهار، إلا في أوقات الصلاة و على أن يخرجوا الصلبان في أيام عيدهم. [۲۱]	ان کا کوئی عبادت خانہ اور کنیسہ نہیں ڈھایا جائے گا اور ان کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ دن رات جب چاہیں اپنے ناقوس بجائیں، سوائے نماز کے اوقات کے، اور اپنی عید کے دنوں میں انھیں صلیب کے جلوس نکالنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲- دوسری غلط فہمی یہ ہوئی کہ ضعیف روایات میں آنے والے اس خالص انتظامی فیصلہ کو شرعی حکم سمجھ لیا گیا۔ ان روایات کے بہ موجب اہل ذمہ کے حق میں یہ فیصلہ صرف ایک انتظامی فیصلہ تھا۔ اس کی کسی شرعی بنیاد کا تذکرہ اور حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ یہ غلطی صرف اسی مسئلہ میں نہیں ہوئی، بلکہ ذمیوں کے سلسلے کے بہت سے احکام سیکورٹی کے مقصد سے اور حکومت اور مسلمانوں کو کسی دھوکے سے بچانے کے لیے دیے گئے تھے۔

لوگوں نے ان کو شرعی احکام سمجھ لیا۔

اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسا کوئی حکم ثابت نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو عبادت گاہوں کی تعمیر سے روکا جائے گا۔ جو چند روایتیں اس سلسلے میں ملتی ہیں وہ بے اصل ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں یہ حکم دیا گیا ہو یا حکومت کی یہ عام پالیسی رہی ہو، یہ بھی ثابت نہیں ہے۔

اگر مسلمانوں کے زیر اقتدار اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ شرک کے مراکز کا وجود جائز نہ ہوتا اور یہ چیز ایک اسلامی حکومت کے مقصد وجود کے منافی اور اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تو اس میں 'امصار المسلمین' اور دیگر آبادیوں میں کیا فرق ہے؟ اس بنیادی اور اہم سوال پر غور کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ یہ احکام صرف امن عامہ اور کسی فساد و بدامنی سے بچنے کے مقصد سے دیے گئے تھے۔ اسی لیے تاریخی روایات میں آیا ہے کہ احکام یہ دیے گئے تھے کہ ذمی مسلمانوں کی آبادیوں میں اپنے مذہبی جلوس نہ نکالیں، نماز کے اوقات میں ناقوس نہ بجائیں، خنزیر لے کر مسلمانوں کے علاقوں میں نہ جائیں، وغیرہ۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور تاریخ طبری میں صاف صراحتیں ہیں کہ یہ ممانعتیں مسلمانوں کے مجمع اور احاطوں سے متعلق ہیں۔

یقیناً حضرت عمرؓ اور خلفائے راشدین کے احکام کی حیثیت سنت متبوعہ کی ہے، مگر علم وحکمت اور فقہ ودانائی کا تقاضا ہے کہ ان میں یہ فرق کیا جائے کہ کون سے احکام سیاست وانتظام کے مقصد سے دیے گئے تھے، جو سیاسی اور انتظامی صورت حال بدل جانے سے خود بہ خود بدل جائیں گے اور کن احکام کی حیثیت شرعی قوانین کی ہے۔ انتظامی اور سیاسی مصالح پر مبنی حکموں کو شرعی اور قانونی حیثیت دینا خود ایک طرح کی تحریف ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی ممالک میں اپنی بے ضرر عبادت گاہیں بنانے کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے کبھی منع نہیں فرمایا۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں ان میں سے جو مستند ہیں وہ صریح نہیں ہیں، بلکہ ان میں ایسی کوئی بات کہی ہی نہیں گئی ہے۔ اور جو صریح اور واضح ہیں وہ بے اصل

اور موضوع ہیں۔ ☆

یہ خوب لطیفہ ہے کہ آپ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں اپنی عبادت گاہیں تک بنانے کی اجازت نہ دیں اور پھر یہ دعوی کریں کہ ہم ان کو مذہبی آزادی دیتے ہیں۔ کیا پوری کی پوری قوم کو ایسے دباؤ میں رکھنا 'اکراہ' نہیں ہے؟؟ عالم عرب کے بعض 'مفکرین' اور غلو کا شکار لوگوں نے باقاعدہ یہ مہم چھیڑی ہے کہ عرب ممالک خصوصاً مصر وشام کی عیسائی آبادیوں کی عبادت گاہیں ڈھانا (بلکہ اور بھی ناگفتہ بہ اہانت آمیز اقدامات) مسلمانوں کا دینی فریضہ ہیں۔ کس قدر زیادتی اور خودغرضی کی بات ہے کہ یورپ میں جانے والے مسلمان وہاں اپنے لئے عبادت گاہیں قائم کریں، گرجے مسجدوں میں تبدیل کرنے کی اجازت مانگیں اور ان کے قیام میں حکومت سے مراعتیں لیں، اور اپنے ملکوں میں مطالبہ کریں کہ گرجے اور عبادت گاہیں ہرگز نہ قائم کی جائیں!!

غیر مسلموں کی اہانت نہیں کی جائے گی

اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی حیثیت جاننے کے لئے قرآن وسنت کی اصولی تعلیمات پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں جس آیت کی طرف سب سے پہلے نظر جاتی ہے وہ یہ ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِيْنُونَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ۔ (التوبۃ:۲۹)

جنگ کرو اللہ اور آخرت پر ایمان نہ لانے اور اللہ ورسول کے محرمات کو حرام نہ قرار دینے اور دین حق کو اختیار نہ کرنے والوں سے، یعنی اہل کتاب سے، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں، اس حال میں کہ وہ (اسلامی ریاست کی) اطاعت قبول کریں۔

اس آیت میں جن طاقتوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے وہ بڑے درجہ کی جنگ جوئی

☆ اس موضوع کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'غیر مسلموں کے تعلقات اور ان کے حقوق' ص ۲۵۰ تا ۲۵۴ (معاون مدیر)

کی مرتکب تھیں، زمین میں ان کا فساد اور اسلام دشمنی عروج پر تھی۔ نیز ان کے تکبر ونخوت سے مسلم ریاست کو شدید اور حقیقی خطرے لاحق تھے۔ اس ظالم وجابر طاقت کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا تو کہا گیا کہ جنگ اس وقت تک جاری رکھی جائے اور ختم نہ کی جائے جب تک کہ ان کا تکبر خاک میں نہ مل جائے اور یہ اطاعت وزیردستی قبول نہ کرلیں اور جزیہ نہ ادا کریں۔

اس آیت میں جنگ کی انتہا کی شرط بتائی گئی ہے کہ وہ 'وَهُمْ صَاغِرُونَ' کی حیثیت قبول کریں۔ 'صاغرون' عربی مادہ 'ص، غ، ر' سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس مادہ کے بعض الفاظ میں ذلت کے معنیٰ آتے ہیں اور اسی بنیاد پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اسلامی ریاست میں ذمیوں کو کم تر اور حقیر بنا کر رکھا جائے گا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس لفظ میں تابع ہوجانے اور بڑائی اور تکبر چھوڑ دینے کے معنیٰ بھی آتے ہیں۔ مشہور امام لغت ابن منظور نے لکھا ہے کہ 'صغار عظمت کی ضد ہے'۔[۲۲]

اس آیت میں جنگ کی جو انتہا بتائی گئی ہے کہ وہ 'صغار' کے ساتھ جزیہ کی ادائی قبول کریں، اس کا مطلب یہی ہے کہ روم کی متکبر طاقت کو، جو ایک عرصہ سے اسلامی ریاست کے خلاف جرائم کی مرتکب بھی ہے اور مستقل جنگ چھیڑے ہوئے ہے، اس کو اب جھکا کر ہی دم لیا جائے۔ علامہ ابن القیمؒ نے اس کی تشریح میں پہلے تو ان لوگوں کے بعض اقوال نقل کیے جو ذمیوں کی تحقیر کو اس حکم کا تقاضا سمجھتے تھے، پھر لکھا ہے:

وهذا كله مما لا دليل عليه ولا هو مقتضى الآية، ولا نقل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عن الصحابة انهم فعلوا ذلك، والصواب في الآية ان الصغار هو التزامهم لجريان أحكام الملة عليهم، واعطاء الجزية، فان التزام ذلك هو الصغار۔[۲۳]

ان سب باتوں کی کوئی دلیل نہیں ہے، نہ یہ آیت کا مطلب ہے نہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے ایسا کیا۔ آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ 'صغار' یہ ہے کہ وہ مسلم حکومت کی قانونی برتری تسلیم کرلیں اور جزیہ ادا کریں، بس ان کو قبول کرلینا ہی 'صغار' ہے۔

علامہ ابن قیمؒ نے یہاں قرآن وسنت کے نصوص کی تفسیر کے ایک نہایت

بنیادی اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابۂ کرام کے عمل سے الگ کر کے قرآن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی ورنہ بہت سی غلط فہمیاں ہوسکتی ہیں، تعبیر وتشریح (Interpretation) کے نام پر بائبل کو جس طرح بدل کر رکھ دیا گیا وہ اس کی مثال ہے۔ قرآن کی حفاظت کا ایک معجزاتی پہلو یہ ہے کہ آیات واحکام قرآنی کی تشریح اور اس کے حدود ومعیار کو متعین کرنے کے لئے ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔ اس اصول کی بنا پر ہم قطعی طور پر اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت کی تشریح میں یہ تصور اور اس پر مبنی ہر رائے بالکل غلط ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری ذلیل بنا کر رکھے جائیں گے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ اس کے بالکل خلاف ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوہ

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسلامی ریاست میں بسنے اور اس کی اطاعت قبول کرنے والے غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ آپؐ نے ان کے ساتھ عملاً جو برتاؤ کیا، ان کی جو قانونی حیثیت اور سماجی مقام اپنے طرز عمل سے متعین فرمایا، وہ شریعت کا قانون اور ہر مسلم ریاست کے لیے رہ نما پالیسی ہے۔

سنہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو وہاں کے سرداروں کی ایک تعداد نے آپؐ کی اطاعت قبول کی، لیکن اسلام نہیں لائے۔ آپؐ نے ان کو تحفوں سے نوازا، یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئے اور اس کے جاں نثار بن گئے۔ فتح مکہ کے بعد ہی قبیلۂ نجران نے اطاعت قبول کی۔ نجران جنوب عرب میں رومی حکومت کے تابع عیسائی آبادی والا ایک بڑا منطقہ تھا۔ یہ لوگ باقاعدہ جزیہ دینے والے ذمی قرار پائے۔ ان کا وفد مدینہ منورہ آیا تو اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو معاملہ فرمایا وہ تاریخ وسیر اور حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ وہ لوگ بڑی شان وشوکت کے لباس پہن کر آئے۔ آپؐ نے ان کو اپنی مجلس میں ٹھہرایا، انہوں نے اپنی عبادت کرنی چاہی تو صحابہ نے روکنے کا ارادہ کیا، مگر آپؐ نے صحابہ کو منع کیا اور عیسائیوں نے مسجد نبوی ہی میں اپنی عبادت کی۔[۲۴]

سنہ ۷ھ کے بعد کا واقعہ ہے، (اور ہوسکتا ہے کہ سنہ ۸ھ میں مکہ فتح ہونے کے بعد کا ہو، بہر حال اسلام کے مدینہ میں قوت حاصل کرنے کے بعد کا واقعہ ہے) کہ مدینہ کے ایک بااثر غیر مسلم شخص سے حضرت بلالؓ نے کچھ قرض لیا۔ وہ قرض اسلامی ریاست کی بعض ضروریات (غرباء کی امداد) کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ایماء پر لیا گیا تھا۔ اس تاجر نے خود ہی حضرت بلالؓ سے کہا تھا کہ اس قسم کی ضروریات کے لیے کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، تم مجھ سے لے لیا کرو۔ اچانک ایک دن وہ عین اذان کے وقت تاجروں کے ایک گروہ کے ساتھ آدھمکا اور حضرت بلالؓ سے نہایت ترش روئی اور بدتمیزی سے مخاطب ہوا: او حبشی! تجھے یاد ہے؟ بس چار دن بچے ہیں! اگر وقت پر قرض ادا نہیں ہوا تو تجھے پکڑ کر بکریاں چرانے پر لگادوں گا''۔ حضرت بلالؓ حضورؐ کے پاس پہنچے اور قصہ سنایا۔ کچھ ہی دیر کے بعد فدک سے کچھ مال آ گیا جس سے وہ قرض ادا کر دیا گیا۔ ۲۵

یہ واقعہ عہد نبوی میں ذمیوں کو دبا کر اور ذلیل کر کے نہ رکھے جانے کا واضح ثبوت ہے۔

زید بن سعنہ ایک یہودی مذہبی عالم تھے، مال دار اور باحیثیت تھے۔ ان کے قبول اسلام کا بڑا مؤثر واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا ہے۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے کچھ قرض کا معاملہ کیا۔ وہ جان بوجھ کر وقت پورا ہونے سے پہلے آ پہنچے اور مجمع عام میں، جب آپ صحابۂ کرام کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے، آپؐ کے کپڑے پکڑ کر کہا: محمد! قرض نہیں واپس کروگے؟ مجھے تمہارے پورے خاندان کا حال معلوم ہے۔ حضرت عمرؓ شدتِ غضب سے سرخ ہو گئے۔ چیخ اٹھے کہ او خدا کے دشمن! میرے سامنے تیری یہ مجال؟ دیکھ! اگر خوفِ خدا دامن گیر نہ ہوتا تو تیرا سر دھڑ سے جدا ہو چکا ہوتا۔ آں حضرت ﷺ سکون و ضبط کی تصویر بنے رہے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کی طرف دیکھا اور کہا: عمر! حق تو یہ تھا کہ تم مجھ سے جلد ادائیگی اور اس سے خوش معاملگی کو کہتے۔ جاؤ، قرض بھی واپس کر دو اور الگ سے میری طرف سے کچھ ہدیہ بھی۔ حضرت عمرؓ کی تلوار تو رک گئی، مگر اخلاق نبوی کی تلوار نے اپنا کام کر ڈالا۔ زید بن سعنہ نے فوراً اسلام قبول کیا اور حضرت عمرؓ سے تنہائی میں بتایا

کہ میں نے یہ حرکت بس امتحان لینے اور پرکھنے کے لئے ہی کی تھی۔٢٦

عہد نبوی کا ایک اور واقعہ حدیث کی متعدد کتابوں میں آیا ہے، جس سے غیر مسلم شہریوں کے مدینہ میں ہر قسم کے دباؤ سے آزاد اور حکومتی اہانت وتذلیل سے محفوظ ہونے کا پتا چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس شدید گرمی میں گاڑھے کے دو کپڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ پسینہ سے وہ کپڑے بوجھل ہو جاتے۔ ایک یہودی کپڑے کے تاجر کے یہاں شام سے بہتر کپڑا آیا ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: ادھار منگوا لیجئے۔ آپؐ نے کسی کو بھیجا۔ تاجر بدطینت ہی نہیں، بدزبان بھی تھا۔ کہنے لگا: جانتا ہوں، محمد میرا مال ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ آپؐ نے بس اتنا فرمایا: ''جھوٹا، جانتا ہے کہ میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور سب سے بڑھ کر امانت دار ہوں''۔٢٧

ذخیرۂ حدیث میں اس سلسلے کے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔ اسلامی ریاست اپنے وفادار غیر مسلم شہریوں کو کس نظر سے دیکھتی ہے اس کی سب سے واضح اور تفصیلی مثال ہم کو اس تحریری دستور کی دفعات میں ملتی ہے جس کی بنیاد پر مدینہ کی ریاست کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تاریخ وسیر کی کتابوں سے اس دستور اساسی کی دفعات میں یہود مدینہ کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کی گئی ہیں۔ یہ دستور صراحت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سربراہی میں ایک ریاست کا قیام عمل میں آچکا ہے، اس میں یہود کی حیثیت محکوم شہریوں ہی کی ہے، جزیہ کا نام نہیں ہے، لیکن زکوٰۃ کا نام بھی نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہ نام اس وقت تک طے نہیں ہوئے تھے۔ ورنہ ریاست کے لئے یہود کی مالی ذمہ داریاں طے کی گئی ہیں اور ان سے مشترکہ طور پر دفاع میں حصہ لینے کا بھی عہد لیا گیا ہے جو جزیہ کے قائم مقام ہے۔٢٨

بہر حال یہ دستور واضح کرتا ہے کہ اولین اسلامی ریاست نے غیر مسلم شہریوں کی عزت نفس کو کسی طرح مجروح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ دنیاوی حقوق واختیارات میں وہ مسلمانوں کے برابر نظر آتے ہیں۔ یہ دستور اور اوپر مذکور مثالیں حافظ ابن القیمؒ کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں کہ ذمیوں کی تذلیل کا تصور نہ آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کا اور صحابہ کرام کا ایسا عمل تھا۔

آیتِ جزیہ کا صحیح مفہوم

وہ غیر مسلم جو برسر جنگ نہ ہوں، ان کے ساتھ قرآن کریم نے حسن سلوک کرنے اور انصاف کا معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ (الممتحنہ:۸) آیتِ جزیہ کے اس حصہ کا وہی مفہوم صحیح ہوسکتا ہے جو قرآن کی اس عمومی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت اور اسوہ کے مطابق ہوگا اور جو مفہوم ان کے خلاف ہوگا وہ قطعی طور پر قابل اصلاح قرار پائے گا۔ مگر یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اس سب کے باوجود یہ کہنا مشکل ہے کہ 'صاغرون' کا لفظ تحقیر وذلت کے مفہوم سے بالکل خالی ہے اور اس کے معنی صرف مسلمانوں کی حکومت قبول کر لینے کے ہیں۔ عربیت کی رؤ سے آیت میں 'ذلت' کا مفہوم ضرور ہے۔ اوپر ذکر کیے گئے اصول کے مطابق اور آیات کے تاریخی پس منظر، شان نزول نیز سیاق قرآنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس آیت پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس آیت میں اسلامی ریاست کے اطاعت گزار اور وفادار غیر مسلم شہریوں کی تذلیل کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ یہ محارب، توسیع پسند اور متکبر رومی طاقتوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اس سیاق میں اور جاری جنگ کے ماحول میں حکم دیا گیا ہے کہ ان سے جنگ کرو، اور اس وقت تک کرتے رہو جب تک یہ جھک کر اور ذلیل ہوکر تمہاری اطاعت وباج گذاری قبول نہ کرلیں۔ یعنی محارب طاقت جب جھک جائے اور شکست تسلیم کرکے اطاعت قبول کرلے تو اب عام شہریوں کے لیے 'صغار' اور ذلت کا یہ حکم باقی نہیں رہے گا۔

لہٰذا اس آیت میں محاربین کی تذلیل وتحقیر کا پہلو تو ضرور ہے۔ اور ہر قوم اپنے دشمنوں، خصوصاً جنگ جو دشمن کے خلاف فوجوں اور عوام کے درمیان اسی قسم کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ پھر جب یہ جنگ عام جنگ نہ ہو، راہ حق کے لئے جاں بازی اور اللہ کے دین کے دشمنوں سے کشمکش ہو، تب تو یہ بڑا اہم اور ضروری پیغام ہوتا ہے کہ ''ان بدبختوں اور ظالموں کے تکبر کو خاک میں ملانے تک جنگ کرو''۔ یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے بے ضرر غیر مسلم شہری اس 'حکم صغار' میں مراد نہیں ہیں۔

اس تفسیر کی خالص فنی تعبیر یوں کی جائے گی کہ 'حتّٰی' حکم قتال کی غایت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور قتال کی انتہا 'صغار' کے ساتھ جزیہ قبول کر لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالاتفاق جیسے ہی محارب قوم جزیہ پر راضی ہوگی قتال رک جائے گا، وہ عملاً جزیہ دینے تک نہیں چلے گا۔ مفسرین نے یہاں اس کی صراحت کی ہے کہ قتال کی انتہا کے طور پر جو 'جزیہ دینا' کہا گیا ہے اس سے مراد 'جزیہ دینے پر راضی ہوجانا' ہے۔۲۹ بعض فقہاء نے بھی صراحت سے یہ بات کہی ہے۔ امام شافعی کتاب الأم میں فرماتے ہیں:

وإذا أخذ منهم الجزية أخذ ها بإجمال..... ولم يقل لهم قبيح والصغار أن يجري عليهم الحكم لاأن يؤذوا۔۳۰

ذمیوں سے جزیہ خوب صورتی اور نرمی سے لیا جائے..... ان سے کوئی بری بات نہ کہی جائے۔ قرآن میں جس 'صغار' کا تذکرہ ہے اس کا مطلب بس یہ ہے کہ ان کے اوپر ریاست کے قوانین کا نفاذ ہو، نہ یہ کہ ان کو ستایا جائے۔

کچھ خراسانیوں نے اہل ذمہ کو ذلیل کرنے کی بات کہی تو امام نوویؒ اور دیگر فقہاء نے اس کو باطل و بے اصل بات کہا۔ مغنی المحتاج میں ہے:

''یہ طریقہ باطل ہے، اور اس کو مستحب یا ضروری کہنا اس سے زیادہ غلط''۔۳۱

'شروط عمریہ' کا مسئلہ

حضرت عمرؓ کے زمانے میں، جب عراق وشام اور افریقہ کے وسیع وعریض علاقے فتح ہوئے اور بڑی تعداد میں قومیں ذمی بنیں اور تاریخ شاہد ہے کہ خوشی خوشی ذمی بنیں اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے ہم مذہب حکم رانوں کے خلاف لڑیں، تاریخ کی بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس وقت ان پر کئی ذلت آمیز احکام نافذ کیے گئے، مثلاً ان کی پرانی عبادت گاہوں کی مرمت وتجدید نہیں کی جائے گی، وہ سر کا اگلا حصہ منڈائیں گے، زین کس کر گھوڑے پر نہیں بیٹھیں گے، مسلمانوں کے لئے کھڑے ہوا کریں گے، جس مسلمان کے ساتھ تجارت میں شرکت کریں گے فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوگا، وغیرہ۔ یہ

سب بے اصل اور موضوع قسم کی روایتیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور روایت یہ ہے کہ اہل شام نے خود اپنی طرف سے لکھ کر یہ شرطیں قبول کی تھیں، یہ روایت بالکل موضوع ہے۔ ابن القیمؒ نے اپنی کتاب میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کی سند میں ایسے روای بھی ہیں جن کے بارے میں محدثین نے وضّاع، کذّاب، خبیث، عدوّاللہ جیسے الفاظ کہے ہیں۔۳۲

یہی روایت ایک اور سند سے خلال نے (جو امام احمد کے صاحب زادے عبداللہ کے شاگرد ہیں) عبداللہ کے حوالے اور سند سے نقل کی ہے۔ ابن القیمؒ نے اسے اپنی کتاب 'احکام اہل الذمۃ' میں نقل کر کے اس کو اعتبار بخش دیا ہے۔ ان کی سند میں بعض راویوں کا نام 'من أهل العلم' کہہ کر مبہم رکھا گیا ہے۔ بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ مسند احمد کی ان روایات میں ہوسکتی ہے جو امام احمد کے صاحب زادے عبداللہ کے اضافوں میں سے ہیں، مگر مجھے یہ روایت مسند میں باوجود تلاش بسیار کے نہیں ملی۔ ابن القیمؒ نے اسے تین حوالوں سے نقل کیا ہے۔ ابن عساکر نے بھی تاریخ دمشق میں ایک مستقل باب 'ذكر ما اشترط صدر هذه الامة عند افتتاح الشام' کے عنوان سے قائم کر کے یہ تینوں روایتیں نقل کی ہیں۔ ان کے یہاں اس کی ایک مزید سند ملتی ہے۔ ان چار سندوں میں سے دو تو وہ ہیں جن پر ہم اوپر کلام کر چکے ہیں۔ مزید دونوں سندیں بھی نہایت کم زور ہیں۔ ایک میں نامعروف راویوں کے علاوہ عبداللہ بن احمد بن ربیعۃ بن زبر ہیں، جو نہایت مخدوش راوی ہیں۳۳۔ دوسری بھی نامعروف راویوں کی سند سے آئی ہے۔

یہ اس روایت کے ظاہری عیوب ہیں۔ لیکن اہل نظر محدثین کے نقطۂ نظر سے اس کا اصل اور سب سے بڑا عیب ایک اور ہے، اور وہ یہ کہ فن حدیث کے تنقیدی نظام میں اگر کوئی واقعہ غیر معمولی قسم کا ہو اور اس کی طرف لوگوں کی توجہ کا ہونا فطری ہو، اگر وہ غیر معروف قسم کی روایت میں آتا ہو، عام طور پر علماء و راویان حدیث اس کو روایت نہ کرتے ہوں تو محدثین اس کو نہایت مخدوش مانتے ہیں۔ یہ ایک بالکل فطری حقیقت ہے کہ اگر ایسی غیر معمولی شرائط پر کچھ علاقے فتح ہوتے تو ان کو کثیر تعداد میں راوی نقل

کرتے۔ ایک طویل عرصے تک ان روایات کا چھپا رہنا، جب کہ ان کے شہرت کے ساتھ منقول ہونے کے اسباب بہت تھے، یہ خود ان کے بے اصل ہونے کی دلیل ہے۔ زیر نظر روایت کا یہی سب سے بڑا عیب ہے۔ یہ روایت خلال سے پہلے کسی مصنف و جامع حدیث کے یہاں نہیں ملتی، بلکہ خلال کی کتاب 'الجامع لاحکام الملل'، جس کے حوالے سے یہ نقل کی گئی ہے، پتا نہیں اب موجود بھی ہے یا نہیں۔ حالاں کہ اس کے مندرجات ایسے عجیب قسم کے اور اس قدر متوجہ کرنے والے ہیں کہ اس کو علما ضرور نقل کرتے۔ وہ تمام محدثین و مؤرخین، جنھوں نے ان فتوحات کی تاریخ لکھی ہے، مثلاً طبری، بلاذری اور واقدی وغیرہ اور وہ محدثین اور فقہاء جنھوں نے اہل ذمہ کے مسائل پر قانونی دفعات مرتب کی ہیں، مثلاً امام ابو یوسف، ان میں سے کسی کے یہاں یہ روایت نہیں ملتی۔ ہمیں اس کا تذکرہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی نہیں ملتا، جن میں نہایت تفصیل سے اہل ذمہ کے قانونی حقوق اور ذمہ داریوں پر روشنی ڈالنے والے آثار و واقعات لکھے گئے ہیں۔ یہ خود اس کو آخری درجہ ضعیف ٹھیرانے والی بات ہے۔

کسی روایت کا یہ عیب کہ باوجود واقعے کے غیر معمولی ہونے اور نقل و روایت پر آمادہ کرنے والے اسباب کے پائے جانے کے اس کو عام طور پر نقل نہ کیا جائے اور وہ نہایت نادر یا کم زور روایتوں میں پایا جائے اور حدیث کی اہم کتابیں اس سے خالی ہوں، محدثین کے یہاں اس کو بے اصل اور موضوع قرار دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اس روایت کے متن میں ہمیں کثرت سے ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جو کسی صاحب نظر مؤرخ کی نگاہ میں اس کو مشتبہ بنانے کے لیے کافی ہیں۔ مثلاً یہ روایت بتاتی ہے کہ یہ سخت اور ذلت آمیز شرطیں خود مفتوح علاقوں کے عوام نے اپنے اوپر نافذ کی تھیں۔ بھلا کہیں مفتوح کی شرطوں پر معاہدے ہوا کرتے ہیں؟ شرطیں ہمیشہ فاتح کی طرف سے لکھی جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس سے پہلے حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں دوسرے علاقوں میں اس سے کہیں زیادہ آسان اور سہل شرطوں پر لوگوں کو عہد اور اطاعت میں لیا گیا تھا۔[۳۴] پھر حضرت عمرؓ جیسے عادل حکم راں سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ

دوسرے علاقوں کی طرح اہل شام سے بھی انصاف کا معاملہ ہی کریں گے۔ مزید یہ کہ تاریخ شاہد ہے کہ ذمیوں کے ساتھ مسلمانوں نے کبھی یہ معاملہ نہیں کیا۔ کس تاریخ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پکڑ پکڑ کر ذمیوں کے سر کے اگلے بال کاٹے ہوں؟!

غیر مسلم شہریوں کے لباس کا مسئلہ

البتہ لباس کے سلسلے میں تاریخ وسیر اور کتاب الخراج وغیرہ کتب میں متعدد حوالے اس کے ملتے ہیں کہ اہل ذمہ فلاں لباس پہنیں، فلاں نہ پہنیں۔ متعدد لوگوں کو یہاں سخت دھوکا ہوا ہے کہ یہ ان کو نیچا بنا کر رکھنے کی پالیسی تھی۔ اللہ جزائے خیر دے علامہ شبلیؒ کو کہ انھوں نے اپنی تصنیف الفاروق میں بہت اچھی طرح اس غبار کو صاف کر دیا ہے۔ متاخرین نے غلط فہمی سے عموماً مسلمانوں اور غیر مسلم ذمیوں کے درمیان لباس کے فرق کو ذلت کے اظہار کے لیے سمجھا، حالاں کہ ان کو بس یہ حکم تھا کہ وہ عربوں اور مسلمانوں کا سا لباس نہ پہنیں اور اپنے قومی لباس کو نہ بدلیں۔

اس مسئلہ کے تعلق سے دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ حکم یک طرفہ نہیں تھا، بلکہ خود عرب مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں اور عجمیوں کی نقالی کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی سے اس کی ممانعت کر رکھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے بعض گورنروں کو یہ نگرانی رکھنے کی ہدایت دی تھی کہ مسلمان دوسروں کی نقالی نہ کریں۔ دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے لباس اور ہیئت کی نقالی سے روکنے کی اصل حکمت نہ ان کو ذلیل کرنا تھا اور نہ ان کی قومی خصوصیات کا تحفظ اور محکوم قوم کو احساس کم تری سے بچانا تھا (جیسا کہ بعض اہل علم نے آخر زمانے میں سمجھا ہے)۔ بلکہ یہ ایک انتظامی حکم تھا، جس کا مقصد دفاعی تھا اور وہ فاتح طاقت کے تحفظات پر مبنی تھا۔ ایسے علاقوں میں، جہاں ایک نئی قوم نے فتوحات حاصل کی ہیں اور ابھی پورے طور پر دلوں کو فتح کرنے اور ان کے درمیان اسلام پھیلنے میں فطری طور پر کچھ وقت درکار ہے، حضرت عمرؓ نے یہ احکام جاری کیے کہ مفتوح قوم کے لوگوں کو اس سے روکا جائے کہ مسلمانوں کی

سی ہیئت اختیار کریں۔اس وقت ایسے شناختی کارڈوں کا رواج نہیں تھا جن کے ذریعہ کسی شخص کی قومیت اور مذہب کا علم ہو سکے۔آج بھی حفاظت اور امن عامہ کے مصالح کی خاطر حکومتیں مذہب ہی نہیں، ماں باپ کی اصل قومیت ونسل اور مقام پیدائش تک لکھتی ہیں۔اگر اس بے اصل روایت میں آئی ناقابل قبول باتوں اور نامعقول اضافوں سے صرف نظر کر کے صرف معتبر روایتوں کو دیکھیں تو ان کا خلاصہ وہی نکلتا ہے جسے امام ابویوسفؒ نے اپنی کتاب الخراج میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ان احکام کی علّت وحکمت یہ قرار دی تھی کہ ''حَتّٰی یُعْرَفَ زِیُّھُمْ مِنْ زِیِّ الْمُسْلِمِیْنَ'' یعنی: تاکہ ان کی ہیئت ولباس کا مسلمانوں سے امتیاز کیا جاسکے۔۳۵

اس سے معلوم ہوا کہ ان احکام کی حیثیت شرعی وقانونی نہیں تھی، کیوں کہ ان کا تذکرہ نہ کتاب اللہ میں آیا ہے نہ احادیث رسول اللہ ﷺ میں، بلکہ حالات کی نزاکتوں، حفاظتی مصالح (Security concerns) اور ریاست کے تحفظ کے مقصد سے حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ ایک قسم کے سیاسی احکام تھے، جنھیں ان کے سیاق وسباق (Context) ہی میں دیکھا جانا چاہیے۔

جزیہ کی حقیقت

مسلمان جب رومیوں سے جنگ کر رہے تھے تو قرآن کی وہ آیت نازل ہوئی جس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے کہ: ''اب ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک وہ 'جزیہ' دینا قبول کر کے ذلیل نہ ہو جائیں''۔

اُس زمانے کی منظّم حکومتیں مفتوح قوموں اور رعایا پر جو ٹیکس (زمین کے لگان کے علاوہ) ہر آدمی پر لگاتی تھیں اس کو 'جزیہ' کہتے تھے۔علامہ شبلیؒ نے جزیہ پر اپنے مشہور رسالے میں ثابت کیا ہے کہ اس لفظ کی اصل فارسی ''کِزِیَت'' ہے۔طبری نے اپنی تاریخ میں خسرو نوشیرواں (جو عہد نبوی سے پہلے کا ایرانی بادشاہ تھا) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے لوگوں کے اوپر جزیہ کا نظام نافذ کیا اور اس کے اصول وقواعد اور مقدار طے کی۔

علامہ شبلیؒ نے طبریؒ (م ۳۱۰ھ) اور ان سے بھی قدیم مؤرخ ابوحنیفہ دینوری (م ۲۸۱ھ) کی 'الاخبار الطّوال' سے اس کے حوالے دیے ہیں۔

اہل عرب ایران سے قریبی سیاسی رابطے رکھتے تھے، بلکہ پورا مشرقی ساحل شمالی یمن کے مشرقی علاقوں تک انہی کے تابع تھے۔ شمال مشرق میں حیرہ میں آل منذر کی قدیم عرب سلطنت ایران کے تابع ریاست کے طور پر قائم اور مستقل عرب و فارس تعلقات کی نگراں تھی۔ یمن میں کسریٰ کی طرف سے مستقل گورنر متعین ہوتا تھا۔ عہد نبوی میں اس کا نام باذان تھا۔ سیاسی وجغرافیائی قربتوں کے نتیجے میں ثقافتی لین دین کا فطری عمل ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے جب قرآن نے 'جزیہ' کا لفظ استعمال کیا تو کسی کو اس کے سمجھنے میں مشکل نہیں پیش آتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ اس وقت بین الاقوامی سطح پر معروف نظامِ محاصل تھا۔

کیا جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کی سزا ہے؟

جزیہ کے اس بنیادی تصور سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ جزیہ کسی خاص مذہب کو قبول نہ کرنے کی سزا نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے عجم کے حکم راں اس کو اپنے ہم مذہبوں سے بھی لیتے تھے۔ طبری نے نوشیرواں کے تذکرے میں اس کے جزیہ کے نظام کی کچھ تفصیلات لکھی ہیں۔ اس میں کوئی مذہبی تفریق نہیں تھی، بلکہ اس میں حکم راں طبقات اور جنگوں میں شرکت کرنے والوں کو مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ خود نوشیرواں کے حوالے سے اس کی یہ حکمت منقول ہے کہ جو لوگ جنگوں میں حصہ لیتے ہیں وہ ان کی خدمت کرتے ہیں جو کھیتی اور کاروبار کرتے ہیں۔ لہٰذا عام لوگوں کو ریاست کی امداد اپنے مال سے کرنی چاہئے۔

غرض جزیہ اس وقت کا ایک عام بین الاقوامی قانون تھا۔ دنیا کا تمدنی وفوجی سپر پاور فارس اس پر عمل کرتا تھا۔ اسلام نے بھی یہی تصور باقی رکھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ کی جو عبادت فرض کی گئی اور صدقات کی عبادت کا جو نظام رکھا گیا، اس کا ایک اہم مقصد ریاست کا تحفظ اور جہاد فی سبیل اللہ کی تقویت بھی تھا، لیکن زکوٰۃ

چوں کہ خالص عبادتی و مذہبی روح رکھتی ہے، اس لیے غیر مسلموں کو اس کا پابند کرنا جائز نہیں تھا، چنانچہ ان کو ریاست کی اجتماعی ضروریات کے سلسلے میں ایک بہت معمولی چیز کا ذمہ دار بنایا گیا ہے اور وہ جزیہ کا ٹیکس ہے۔

حضرت عمرؓ نے یہ قانون جاری کیا تھا کہ جزیہ صرف ان لوگوں پر ہوگا جن کو اسلامی ریاست اپنے تحفظ میں لے گی اور وہ جنگی خدمات انجام نہیں دیں گے۔ جن لوگوں سے جنگی خدمات کا مطالبہ کیا جائے گا وہ خود بہ خود جزیہ سے مستثنیٰ قرار پائیں گے۔ عراق کے افسرانِ حکومت کے نام انھوں نے یہ ہدایت بھیجی تھی:

لیستعینوا بمن احتاجوا إلیهم من الأساورة ویرفعوا عنهم الجزاء.[۳۶]	سابق حکومت کے کارندوں میں سے جن کی ضرورت ہو مدد لی جائے اور ان کا جزیہ معاف کردیا جائے۔

آذربائیجان کے لوگوں کے بارے میں حکم فاروقی تھا کہ جو ایک دفعہ کسی معرکہ میں حصہ لے گا اس کا سال بھر کا جزیہ معاف ہوجائے گا۔[۳۷] آرمینیہ اور جرجان کے لوگوں کو یہ وعدہ لکھ کر دیا گیا کہ یہ لوگ ضرورت پڑنے پر جنگ میں حصہ لیں گے تو ان کا جزیہ معاف ہوجائے گا۔[۳۸] جرجومۃ کا شہر فتح ہوا تو مفتوحین نے شرط رکھی کہ ہم سے جزیہ نہ لیا جائے، ہم مسلمانوں کی مدد کریں گے۔ ان کی یہ بات مان لی گئی۔[۳۹]

امام عامر شعبیؒ (جن کی ولادت ۲۰ھ اور وفات پہلی صدی کے خاتمہ پر ہوئی ہے) فرماتے ہیں:

أدرکت الأئمة الفقیه منهم وغیر الفقیه یغزون بأهل الذمة فیقیمون لهم ویضعون عنهم جزیتهم.[۴۰]	میں نے فقیہ اور غیر فقیہ ہر قسم کے حکام کو دیکھا ہے کہ وہ غیر مسلم شہریوں کے ساتھ جنگ کو جاتے تھے اور ان کا حصہ غنیمت میں لگاتے تھے اور جزیہ معاف کردیتے تھے۔

اسی بنا پر اب اکثر علماء کا گویا اتفاق سا ہوگیا ہے کہ جزیہ حفاظت کا بدلہ اور فوجی خدمات کا معاوضہ تھا۔

جزیہ دراصل سادہ سا محصول ہے

غیر مسلم مفتوح اقوام کو جنگ میں حصہ لینے اور ریاست کے دفاع کا فرض انجام دینے کا عموماً پابند نہیں بنایا گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مفتوحین کو یکا یک وفاداریاں بدلنے پر اس درجہ مجبور کرنا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ خون بہانے پر تیار ہو جائیں، ایک نامناسب بات تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک اسلامی ریاست مخصوص عقائد وافکار اور مخصوص مقاصد کے لئے قائم ایک مشنری اور دعوتی ریاست ہوتی ہے۔ اس کا کام صرف امن کا قیام، شہریوں کی فلاح و بہبود سے آگے بڑھتے ہوئے پوری دنیا میں مخصوص ذوق و مزاج اور عبادت الٰہی پر قائم نظامِ زندگی عام کرنا ہوتا ہے۔ غیر مسلموں کو اپنی مرضی کے خلاف ایسی ریاست کے لئے خون بہانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے ان سے صرف ان کی جان ومال کے تحفظ کا معاوضہ جزیہ کی شکل میں لیا جاتا تھا۔

یہ عاجز اس حقیقت سے اتفاق کے ساتھ اس سلسلے میں ایک ذرا مختلف موقف رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ جزیہ اپنی بنیادی حیثیت میں صرف ایک سادہ سا محصول (ٹیکس) ہے، دیگر ان محصولات کی طرح جو ہر حکومت اپنی ملکی ضرورتوں اور سماجی خدمات کی انجام دہی کے لیے لیا کرتی ہے۔ ان کے ذریعہ ملک کے دفاع کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے، حکومتی عملہ کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں، رفاہ عامہ کے کام، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، سینچائی کے انتظامات اور دیگر ملکی امور انجام دیے جاتے ہیں اور ہر فردِ معاشرہ او رریاست کا باشندہ کم وبیش اس بار کا کچھ نہ کچھ حصہ اٹھاتا ہے۔

مسلمانوں پر زکوٰۃ کی شکل میں جو عبادت فرض ہے اس کا عبادتی پہلو تو یہ ہے کہ بندہ گویا خدائے قدوس کی خدمت میں عقیدت ووفا کی نذر گذارتا ہے۔ اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ، رفاہ عامہ اور غریبوں کی خدمت کا ذریعہ ہے۔ اُس کی اِس عبادتی حیثیت کی وجہ سے غیر مسلموں پر جزیہ نام کا ایسا ٹیکس نافذ کیا گیا جو عبادتی ودینی رنگ سے خالی ہے، تاکہ غیر مسلموں کو کسی دینی قسم کی چیز کا پابند

نہ بنایا جائے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جنگی خدمات انجام دینے والوں کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ جزیہ فوجی خدمت کا بدل ہے، بلکہ یہ دراصل حکومت کی طرف سے ٹیکس کی معافی کا ایک اعلان تھا، جیسا کہ غریب کے لیے اور عورتوں بوڑھوں اور بچوں کے لئے یہی معافی اس لیے تھی کہ عموماً یہ کمانے والے نہیں ہوتے۔

واضح رہے کہ عہد نبوی، پھر خلافت راشدہ اور بعد کی ابتدائی صدیوں میں جو جزیہ لیا جاتا تھا وہ مسلمانوں سے لی جانے والی زکوٰۃ سے کہیں کم تھا۔

غیر مسلم شہریوں کی دل داری کی ایک اہم مثال

حضرت عمرؓ کے زمانے میں شمالی عرب کے عیسائیوں میں ایک بڑی طاقت قبیلۂ بنوتغلب کی تھی۔ انہوں نے یہ عرض داشت رکھی کہ ہم کو ایرانیوں اور عجم سے ممتاز رکھا جائے، ہم عرب ہیں، آپ ہم سے صدقہ یا زکوٰۃ کے نام سے جو چاہیں لیں۔ (یاد رہے کہ جزیہ اصلاً ایک ایرانی نظام تھا اور بنوتغلب عیسائی اور رومی حلیف ہونے کے ناطے ایرانیوں سے قدیم عداوت رکھتے تھے)۔ حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرام کے مشورے سے ان کی یہ درخواست قبول کرلی۔[۴۱] اس طرح بعد کے زمانوں کے لیے گویا یہ اصول طے پایا کہ غیر مسلم شہری جزیہ، ذمی وغیرہ اصطلاحات کے بارے میں غلط فہمیوں کی وجہ سے تردد کا شکار ہوں تو ان اصطلاحات پر اصرار کرنا ضروری نہیں۔

موجودہ دور کے مسلم ممالک میں جزیہ کیوں نہیں؟

ہمارے زمانے میں مسلم ممالک میں کہیں جزیہ کے نام سے غیر مسلم شہریوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ بلکہ شیخ مصطفیٰ سباعی، شیخ یوسف القرضاوی، شیخ عبدالکریم زیدان، شیخ وھبہ الزحیلی اور شیخ مصطفیٰ الزحیلی وغیرہ علماء اس کے قائل ہیں کہ آج کی مسلم ریاستوں میں جزیہ نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ شاید اصل وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں غیر مسلم شہریوں پر مختلف قسم کے مساوی ٹیکس نافذ ہیں، جو مسلمانوں پر بھی ہیں، اور

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ان ٹیکسوں کو جزیہ کے نام سے موسوم کرنا ضروری نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے زمانے میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم شہری جنگوں میں حصہ لیں تو ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ موجودہ زمانے کے مسلم ممالک میں ان کے غیر مسلم شہری قومی دفاع کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہیں۔

جزیہ کی مقدار

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اور خلافت راشدہ کے دور میں الگ الگ وقتوں میں مختلف علاقوں سے الگ الگ شرح کے مطابق جزیہ لیا گیا اور اکثر وبیش تر غریبوں، متوسط الحال لوگوں اور اہل ثروت کے لئے اس کی الگ مقدار رکھی گئی۔ نیز جو نہ دے سکے اس کو معاف کیا گیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ زمانے اور حالات کے فرق سے جزیہ کی مقدار حکومت اپنی صواب دید سے طے کرسکتی ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجھاد، باب یقاتل عن اھل الذمۃ ولا یسترقون، ۳۰۵۲

۲۔ مثلاً ملاحظہ ہو: المغنی، ابن قدامۃ، کتاب الجہاد، فصل مایوجب عقد الذمۃ

۳۔ سنن ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی الذمی...الخ، ۳۰۵۲

۴۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیۃ، باب اثم من قتل معاہدا بغیر جرم، ۳۱۶۶

۵۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب کتابۃ العلم، ۱۱۱

۶۔ صحیح بخاری، حوالہ سابق

۷۔ سنن نسائی، کتاب القسامۃ، باب سقوط القود من المسلم للکافر، ۴۶۵۳ بسند صحیح

۸۔ حدیث وفقہ کی کتابوں میں طرفین کے دلائل کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

۹۔ مصنف عبدالرزاق، ۱۰/۱۰۱

۱۰۔ فتوح البلدان، ص ۱۴۴

۱۱۔ ابو یوسف، کتاب الخراج، المطبعۃ السلفیۃ ومکتبتہا القاہرۃ، ۱۳۴۶ھ، ص ۱۷۲

۱۲۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب وصیۃ النبی ﷺ بأہل مصر، ۲۵۴۳، مسند احمد، ۵/۱۷۴

۱۳ ردالمحتار: ۴/۳۵

۱۴ حوالۂ بالا

۱۵ ان اقدامات کی تفصیل علامہ شبلیؒ نے اپنی شاہ کار تصنیف الفاروق میں جمع کر دی ہے۔

۱۶ سنن ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزیۃ، ۳۰۴۱

۱۷ طبری، تاریخ الرسل والملوک، ذکر فتح بیت المقدس

۱۸ تفصیل کے لیے ابن حجر کی التلخیص الحبیر، زیلعی کی نصب الرایہ، بیہقی کی سنن کبریٰ اور دیگر کتابیں ملاحظہ ہوں۔

۱۹ مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۲۳۴

۲۰ بدائع الصنائع

۲۱ کتاب الخراج، ص ۱۷۵

۲۲ ابن منظور، لسان العرب، مادہ ص غ ر

۲۳ ابن القیمؒ، أحكام أهل الذمة: ۱/۴۱

۲۴ بیہقی، دلائل النبوۃ، ۵/۳۹۰

۲۵ سنن ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین، ۳۰۵۵

۲۶ صحیح ابن حبان، ۱/۲۸۸، حافظ ابن حجر نے اس روایت کی توثیق کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، دارالمعرفۃ بیروت، ۲۰۰۴ء، ۱/۶۴۸

۲۷ سنن نسائی، کتاب البیوع، باب البیع الی الاجل المعلوم، ۴۶۲۸، مسند احمد، ۲۵۱۸۴

۲۸ یہ دستور ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد اور دیگر اصحاب سیر کے یہاں تفصیل سے ملتا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کے متفرق اجزاء آئے ہیں۔

۲۹ ''حتى يعطوا أى يقبلوا أن يعطوا''، تفسیر ابوسعود وروح المعانی، سورہ توبہ آیت: ۲۹

۳۰ محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الأم: ۴/۲۲۰، طبع دارلفکر

۳۱ مغنی المحتاج شرح المنہاج، فصل فی الامان

۳۲ بیہقی، السنن، ۹/۲۰۲، شیخ البانی نے اس روایت پر اپنی کتاب إرواء الغلیل (۵/۱۰۳) میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔

۳۳ لسان المیزان، ۳/۲۵۳

۳۴ ابن جریر، ابن کثیر اور بلاذری نے اپنی کتابوں میں ان معاہدوں کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے ان میں سے کئی معاہدوں کو 'الفاروق' میں نقل کیا ہے۔

۳۵ کتاب الخراج: ۱۵۲

۳۶ تاریخ طبری، ۲/۴۸۲

۳۷ طبری، ۲/۵۴۰

۳۸ طبری، ۲/۵۴۱

۳۹ الفاروق، بہ حوالہ فتوح البلدان، ص ۱۵۹

۴۰ مصنف ابن ابی شیبہ، ۱۷/۵۹۵

۴۱ السنن الکبری، باب نصاری العرب تضعف علیھم الصدقۃ، کتاب الأموال لابی عبید: ۱/ ۶۹

☆☆☆

مقالہ نگار حضرات سے گزارش

۱- کوشش کی جاتی ہے کہ محترم مقالہ نگاروں کی تحریریں تحقیقاتِ اسلامی میں جوں کی توں شائع ہوں، لیکن بسا اوقات موضوع پر ارتکاز کے مقصد سے یا مجلّہ کے صفحات کی تنگ دامانی کے سبب کچھ تحریریں مختصر کرنی پڑتی ہیں۔ زبان و بیان کی درستگی اور سلاست پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ امید ہے، فاضل مقالہ نگار اسے بہ طیبِ خاطر گوارا کریں گے۔

۲- تحقیقاتِ اسلامی میں صرف غیر مطبوعہ مقالات شائع کیے جاتے ہیں، اس لیے جو مقالہ اس میں اشاعت کے لیے بھیجیں اسے کسی دوسرے رسالے میں ہرگز نہ بھیجیں۔

۳- اگر تحقیقاتِ اسلامی میں کسی مقالہ کی کسی وجہ سے اشاعت ممکن نہ ہوگی تو اس کی اطلاع کردی جائے گی۔ سہ ماہی رسالہ ہونے کی وجہ سے عموماً مقالہ نگاروں کو زحمت انتظار برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس پر ہم معذرت خواہ ہیں۔

۴- فوٹو اسٹیٹ کاپی میں بسا اوقات بعض الفاظ یا حروف مٹ جاتے ہیں۔ اس لیے براہ کرم مقالہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں اور اصل کاپی روانہ کریں۔

۵- مقالہ خوش خط، ورق کے ایک جانب، صفحہ کے دونوں طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھا جائے۔ بہتر ہے کہ اسے کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بھیجا جائے۔ کمپیوٹر کتابت کی صورت میں اسے درج ذیل ای میل پر بھیجا جاسکتا ہے:

tahqeeqat@gmail.com, mrnadvi@yahoo.com

عصری تہذیبی کشمکش میں
بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

——————— ڈاکٹر محمد اکرم وِرک

اربابِ دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ گلوبلائزیشن (Globalization) کے اس دور میں بین المذاہب مکالمہ (Inter-Faith Dialogue) کی ضرورت و اہمیت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ باہمی مکالمہ ہی وہ واحد آپشن ہے جس سے کسی بھی مذہب کا داعی مخاطب کو اپنی دعوت کی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ باہمی مکالمہ دعوت کا ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعے مخاطب کو زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ گفتگو کا یہ ایسا اسلوب ہے جس میں متکلم اور سامع کے درمیان براہِ راست گفتگو ہوتی ہے اور حقائق پوری طرح نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ پھر یا تو مخاطب مدِّ مقابل کے موقف کو قبول کر لیتا ہے یا اسے دلائل کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔ یہ مکالمہ افراد کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان بھی۔

بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت

بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپؐ کی امت آخری امت ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام انسانوں تک پیغامِ الٰہی پہنچانا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ قرآن و حدیث کے متعدد نصوص سے واضح طور پر امت محمدیہ ﷺ پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ مختلف ممالک کے حکم رانوں کے نام رسول اللہ ﷺ کے دعوتی و تبلیغی خطوط جہاں معاصر مذاہب اور تہذیبوں سے آپؐ کے مکالمہ کی ایک خوب صورت مثال ہیں، وہیں یہ خطوط اس بات کی

بھی دلیل ہیں کہ اسلام اصلاً دینِ دعوت ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ کار تمام عالم کو محیط ہے ،اس لیے اس کے عالمی پیغام کو دوسروں تک پہنچانا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ مذاہبِ عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نہ صرف عالم گیر سطح پر دعوت وتبلیغ کا حکم دیا ہے، بلکہ دوسری تہذیبوں، قوموں اور افراد کے ساتھ گفتگو اور مکالمے کے با قاعدہ اصول بھی بیان کیے ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُ إِلِى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِىْ هِىَ أَحْسَنُ. (النحل: ۱۲۵)	آپؐ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔

اسلام کی یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ھ) لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو سچائی قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو الہامی اور تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے، لیکن صحیفہ محمدی ﷺ نے نہایت اختصار، لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔''[۱]

مذاہبِ عالم میں عملی طور پر صرف عیسائیت اور اسلام ہی تبلیغی مذاہب ہیں، دیگر تمام مذاہب کا دائرہ کار کسی خاص علاقے یا نسل تک محدود ہے، جبکہ عیسائیت کی عالم گیر دعوت اور اشاعت بھی حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے منافی ہے، کیوں کہ ان کی بعثت خاص بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔حضرت عیسیٰؑ کا بیان ہے:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا'' (انجیل متّی، ۱۵:۲۴)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب بارہ نقیب مقرر فرمائے اور ان کو مختلف علاقوں کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ کیا تو بطور خاص ان کو تلقین فرمائی:

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (انجیل متّی، ۶:۱۰)

الغرض یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو نہ صرف دینِ اسلام کی ترویج واشاعت کا حکم دیا ہے، بلکہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کے بنیادی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے۔ داعی اعظم ﷺ نے مختلف اقوام اور تہذیبوں کے ساتھ جو مکالمہ فرمایا، سیرتِ طیبہ سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپؐ نے ایک طرف عرب کی مشرکانہ تہذیب کے نمائندہ افراد، سردارانِ قریش اور ان کے وفود سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ کیا اور دوسری طرف ورقہ بن نوفل سے لے کر نجران کے عیسائی علماء سے آپؐ کا مکالمہ گویا عیسائیت سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ تھا۔ اسی طرح مدنی دور کے اوائل میں میثاق مدینہ، جس کے بڑے فریق یہودی قبائل تھے، یہود سے مکالمہ ہی کی ایک صورت تھی۔

بین المذاہب مکالمے کا بنیادی اصول- ہم زبانی

آں حضرت ﷺ نے مختلف صحابۂ کرام کو دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، کیوں کہ دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو۔ ہم زبانی سے اُنسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہوجاتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا، تاکہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جاسکے اور انہی کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جاسکے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے:

فتعلّمت کتابھم، ومرّت بی خمس عشرة لیلة حتی حذقته وکنت أقرأ لہ کتبھم اذا کتبوا الیہ وأجیب عنہ اذا کتب. [۲]

پس میں نے ان کی زبان میں لکھنا سیکھ لیا۔ ابھی پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں اس میں ماہر ہوگیا۔ جب یہودی کوئی خط آپ کو لکھتے تو میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا اور اگر آپ کو جواب لکھنا ہوتا تو وہ میں لکھ دیتا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک ایرانی عورت حضرت ابو ہریرہؓ (م۵۸ھ) کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے۔ اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی زبان میں کی اور ابو ہریرہؓ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی، پھر آپ نے بچہ عورت کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔[۳]

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام نے دوسری قوموں کی زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں، تاکہ ان سے براہ راست تبادلۂ خیال کرکے ان کے مسائل کو حل کیا جاسکے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تھا، تاکہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ علامہ سرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں:

ان الفرس کتبوا الی سلمانؓ ان یکتب لھم الفاتحة بالفارسیة، فکانوا یقرء ون ذلک فی الصلوة حتیٰ لانت ألسنتھم للعربیة. [۴]

بعض نومسلم ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کی خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کو فارسی میں نقل کر دیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو) نماز میں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔

اس واقعے کو ڈاکٹر حمید اللہؒ نے 'النہایۃ حاشیۃ الھدایۃ' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ (م۳۳ھ) نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، ''بنام خداوند بخشایندہ مہربان''۔ یہ بسم اللہ کا ترجمہ ہے۔[۵]

اس کے علاوہ جن صحابۂ کرام کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف قوموں کی طرف داعی اور مبلغ بنا کر روانہ فرمایا ان کے معاملے میں بھی یہ چیز آپ ؐ کی حکمتِ عملی کا حصہ نظر آتی ہے کہ وہ مبلغ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، بہ صورتِ دیگر وہ اس قوم کی زبان، رسم ورواج اور کلچر سے آگاہ ہوں۔

اسلام کی ترجیح - امن اور مکالمہ

سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو جنگ اور امن میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا موقع ملا تو آپ ؐ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے موقع پر آپ ؐ نے ایسی شرائط پر بھی صلح قبول کر لی جن سے بہ ظاہر مسلمانوں کی پسپائی کا تاثر ملتا تھا۔ اگرچہ ان شرائط کو قبول کرنے سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوئی اور بعض صحابہ کو اس پر بڑا اضطراب بھی ہوا، لیکن آپ ؐ نے جنگ پر امن کو ترجیح دی، کیوں کہ آپ ؐ اپنے نورِ بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ امن کی صورت میں جب مسلمانوں اور مشرکوں کو آزادانہ ماحول میں میل جول کے مواقع حاصل ہوں گے تو قریش اور دیگر قبائل مسلمانوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر ملنے لگے اور انہیں ایک دوسرے کے موقف کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا تو صرف دو سال کے عرصہ میں یعنی فتح مکہ ۸ھ تک اتنی بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے جتنے پہلے تمام عرصے میں نہیں ہوئے تھے۔ امام زہریؒ (م ۱۲۵ھ) کا بیان ہے:

فما فتح فی الاسلام فتح قبله کان أعظم منه، انما کان القتال حیث التقی الناس، فلما کانت الهدنة، ووضعت الحرب وآمن الناس بعضهم بعضاً، التقوا فتفاوضوا فی الحدیث

صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہو کر رہتی تھی، لیکن جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوگئی اور لوگ ایک دوسرے سے بے خوف ہوگئے، باہم ملے جلے، باتیں ہوئیں تو کوئی عقل مند ایسا نہیں تھا جس سے

الـمـنـازعة، فـلـم يكلم احد بالاسلام يعقل شيئا الادخل فيه، ولقد دخل فی تيـنـک الـسـنتيـن مثل مـن كـان فـی الاسلام قبل ذلک او اكثر. [۶]

اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے اسے قبول نہ کیا ہو۔ چنانچہ جتنے لوگ ابتداء سے اب تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔

اسلام میں دعوت اصل ہے اور جہاد ضرورتاً فرض کیا گیا ہے۔ وہ صرف اسلامی تہذیب وتمدن کے دفاع اور استحکام کے لیے ہے، اس لیے لامحالہ اسلام کی ترویج واشاعت کا تمام تر انحصار صرف دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ پر ہے، اس لئے ایک سچے داعی کی حیثیت سے ہمارے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرنا دینِ اسلام کا بنیادی تقاضا بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ باہمی مکالمہ اور امن وامان کا ماحول اسلام کی ضرورت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب بھی دلائل کی بنیاد پر گفتگو ہوگی تو میدان ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ہاتھ ہی رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُون. (التوبۃ:۳۳)

(وہ اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو کیسا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر عقل واستدلال کی رو سے تو مطلق ہے اور وہ کسی زمانہ اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں، البتہ مادی غلبہ اہلِ اسلام کی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ آزادانہ مباحثے اور مکالمے میں آخرکار جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے، جب کہ کامل اور بے داغ سچائی اسلام کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اسلام کے پاس طاغوت کو شکست دینے کے لیے دلائل وبراہین کی ہرگز کمی نہیں ہے اور مکالمے کی میز پر یہی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دلیل ہار جائے تو انسان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے۔ توہین آمیز خاکوں سمیت اہل مغرب کی اسلام کے خلاف موجودہ آویزش دراصل دلیل کی شکست کا اعتراف ہی تو ہے۔ اس وقت جب کہ مغرب دلیل کی زبان میں اسلام کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہے اور اپنی برتر ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں کرنا چاہتا ہے، مسلمان اہل دانش کا کام یہ ہے کہ وہ اہلِ مغرب کو مکالمے کی اس میز پر کھینچ لائیں جہاں انہیں مدِّ مقابل پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس میں اسلام کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہیں، بشرطے کہ ہم اسلام کو صحیح طور پر اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس موقف کی ایک دلیل وہ مکالمہ بھی ہے جو نجران کے عیسائی علماء اور حضور ﷺ کے درمیان ہوا۔ جب عیسائی علماء آپؐ کے دلائل کے سامنے بالکل عاجز آ گئے تو انھوں نے جزیہ دینے کی شرط پر آپؐ سے صلح کر لی۔ عیسائی علماء کا دلیل اور استدلال کو چھوڑ کر جزیہ پر صلح کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ اسلام کا مقابلہ مکالمے اور استدلال کی زبان میں ممکن نہیں۔ اہل علم واقف ہیں کہ ولیم میور (م ۱۹۰۵ء) نے اپنی کتاب The Life of Muhammad میں رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی تو علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) نے اپنے قلم کو جنبش دی، اپنے شعور کو مجتمع کیا اور اپنے فہم و ادراک کو کام میں لاتے ہوئے 'سیرت النبی ﷺ' جیسی معرکہ آرا کتاب سے مستشرق موصوف کا منہ بند کر دیا۔ دورِ حاضر میں 'ضیاء النبی ﷺ' کی صورت میں پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (م ۱۹۹۸ء) نے بھی یہی خدمت انجام دی ہے۔

عصر حاضر میں اسلام کا مکالمہ، لیکن کس مذہب سے؟

اس وقت مختلف سطحوں پر بین المذاہب مکالمے کی ضروت و اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ جون ۲۰۰۴ء میں اوسلو (ناروے) میں پہلی بین المذاہب کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ناروے کی حکومت اور وہاں کے چرچ کی دعوت پر مولانا محمد حنیف

جالندھری، مفتی منیب الرحمٰن، ریاض حسین نجفی اور بشپ سموئیل عزرایاہ وغیرہ نے شرکت کی۔ عالمی سطح کی اس بین المذاہب کانفرنس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے بین المذاہب ہم آہنگی اور محبت کی فضا کو فروغ دینے پر زور دیا۔ 'اعلانِ اوسلو' کے تحت پاکستان میں بھی 'ورلڈ کونسل آف ریلیجنز برائے عالمی امن وعدلِ اجتماعی' کے زیر اہتمام ۱۶ر ستمبر ۲۰۰۴ء کو نیشنل لائبریری ہال، اسلام آباد، میں پہلی بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ مسلسل جاری وساری ہے۔ یقیناً یہ ساری کوششیں لائقِ صد تحسین اور قابلِ قدر ہیں، لیکن اس ساری تگ ودو کے مثبت اور دوررس نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم بعض باتیں طے کرلیں۔ سب سے پہلی بات تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آج کی عالمی صورتِ حال میں اس مکالمے کے اصل فریق کون ہیں؟ اور دوسری یہ کہ اس مکالمے کا ایجنڈا کیا ہے؟ اس طرح ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ہم علمی حلقوں میں اپنا موقف بہتر طور پر پیش کرسکیں۔

فی الوقت دنیا میں اسلام کے علاوہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، جین مت وغیرہ ہی کو دنیا کے بڑے اور زندہ مذاہب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ وحی، الہام اور خدا پر یقین رکھنے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق انہی مذاہب سے ہے۔ اپنی غیر فطری اور غیر عقلی تعلیمات کی وجہ سے ان مذاہب کا ماضی میں بھی انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا ہے، لیکن عقل پرستی (Rationalism) کے موجودہ دور میں مذہب کا لوگوں کی ذاتی زندگی سے عمل دخل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور اس وقت عملی طور پر مسلمانوں کے علاوہ انسانوں کی غالب اکثریت لادین اور سیکولر ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے بعد اس وقت بلا امتیاز رنگ ونسل پوری دنیا میں مغربی سیکولرزم مقبول ترین مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس وقت جب کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک تاریخی یادگار کی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں، یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا سیکولرزم ہی اسلام کا اصل مدِّ مقابل ہے۔

حالات کے سرسری جائزے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جو علمی، فکری اور تہذیبی کشمکش جاری ہے اس کے اصل فریق مغرب کے مذہب سے منحرف سیکولر حلقے اور مذہب پر پختہ یقین رکھنے والے مسلمان ہیں، جب کہ عیسائی علما اس مکالمے کے اصل فریق نہیں ہیں، کیوں کہ مغرب کے عیسائی رہ نما جس مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا مغرب کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے موجودہ کشمکش میں عیسائی علماء سے مکالمہ کی افادیت محدود ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمیں عیسائیت اور دیگر مذاہب سے گفتگو اور مکالمے سے انکار نہیں ہے، تاہم روایتی عیسائی حلقے سے ہماری گفتگو اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ عیسائی مذہبی رہ نما اپنے معاشرے کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ اصولی طور یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت، جب کہ پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی بنی نوع انسان کو وحی الٰہی اور مذہب کی طرف واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مغرب کے مذہبی حلقے اس سلسلے میں مسلمانوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو اپنے عیسائی مخاطبین پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہیے کہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جو الحاد اور لادینیت کے خوف ناک طوفان کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس عالم گیر طوفان کے خلاف مسلمان، مسیحی اور دیگر مذہبی علماء ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں۔ عیسائی علماء کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ واقعی وحی اور آسمانی تعلیمات کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاشرے پر اس کی علم برداری کے خواہش مند ہیں تو انہیں سیکولر حلقے کی تائید کے بجائے وحی اور آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

روایتی مذہبی حلقے سے مکالمے کے بنیادی اصول

بہ حیثیت مسلمان ہم پر لازم ہے کہ نسلِ انسانی کی فلاح اور بہتری کے لئے ہم مسیحیت کے ساتھ مکالمہ میں مشترک صفات پہ زور دیں۔ دینِ ابراہیمی کی مشترک

روایت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کا احترام اور ہمارے مشترک سماجی بندھن وغیرہ عیسائیت کے ساتھ مکالمے کی بنیاد بن سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں مختلف حکم رانوں کے نام آپؐ کے خطوط ہمارے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہرقل اور دیگر عیسائی حکم رانوں کو رسول اللہ ﷺ نے بذریعہ خطوط اسلام کی جو دعوت دی تھی، اس میں یہ آیت درج تھی: قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً (آل عمران:۶۴) (آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب ایسے قول کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں) اس آیت کا مکرر استعمال ہمارے لیے قابلِ توجہ ہے۔ اسی طرح مکاتیب نبوی لے جانے والے سفراء نے جس طرح اپنے مخاطبین سے مکالمہ کیا، وہ اسلوب بھی ہمارے لئے بین المذاہب مکالمے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ (م ۳۰ھ) کو شاہِ مصر مقوقس کی طرف دعوتی خط دے کر روانہ فرمایا۔ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) نے حضرت حاطبؓ اور شاہِ مصر کے درمیان ہونے والے مکالمے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب شاہِ مصر نے حضرت حاطبؓ سے یہ کہا کہ اگر تمہارے صاحب اللہ کے رسول ہیں تو پھر انھوں نے اس وقت اپنی قوم کے خلاف بددعا کیوں نہ کی جب اس نے ان کو ان کے اپنے شہر سے نکالا ؟ تو حضرت حاطبؓ نے فرمایا: عیسیٰ بن مریم کی نسبت آپ خود کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے، پھر جب ان کو ان کی قوم نے سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ان کو بددعا کیوں نہ دی ؟ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا۔ مقوقس اس برجستہ جواب سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا:

احسنت! انت حکیم جاء من عند حکیم ۔ [۷]	تم نے اچھا جواب دیا، تم حکیم ہو اور حکیم کے پاس سے آئے ہو۔

امام ابن قیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے مقوقس اور حضرت حاطبؓ کے باہمی مکالمے کی جو روایت نقل کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

حاطبؓ: ''(اس زمین پر) تم سے پہلے ایک شخص (فرعون) گزرا ہے جو اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اللہ نے اسے آخر واوّل کے لیے عبرت بنا دیا۔ پہلے تو اس کے ذریعے لوگوں سے انتقام لیا، پھر خود اس کو انتقام کا نشانہ بنایا، لہٰذا دوسروں سے عبرت پکڑو، ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت پکڑیں۔''

مقوقس: ''ہمارا ایک دین ہے جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے، جب تک کہ اس سے بہتر دین نہ مل جائے۔''

حاطبؓ: ہم تمھیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام ماسوا (ادیان) کے بدلے کافی بنا دیا ہے۔ دیکھو! اس نبی ﷺ نے لوگوں کو (اسلام کی) دعوت دی تو اس کے خلاف قریش سب سے زیادہ سخت ثابت ہوئے، یہود نے سب سے بڑھ کر دشمنی کی اور نصاریٰ سب سے زیادہ قریب رہے۔ میری جان کی قسم! جس طرح موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کے لیے بشارت دی تھی، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے بشارت دی ہے اور ہم تمھیں قرآن مجید کی دعوت اسی طرح دیتے ہیں جیسے تم اہل تورات کو انجیل کی دعوت دیتے ہو۔ جو نبی جس قوم کو پاجاتا ہے وہ قوم اس کی امت ہو جاتی ہے اور اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس نبی کی اطاعت کرے اور تم نے اس نبی کا عہد پالیا ہے، اور پھر ہم تمھیں دینِ مسیح سے روکتے نہیں ہیں، بلکہ ہم تو اسی کا حکم دیتے ہیں۔''

مقوقس: میں نے اس نبی ﷺ کے معاملہ پر غور کیا تو میں نے پایا کہ وہ کسی ناپسندیدہ بات کا حکم نہیں دیتے اور کسی پسندیدہ بات سے منع نہیں کرتے۔ وہ نہ گمراہ جادوگر ہیں نہ جھوٹے کاہن، بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان کے ساتھ نبوت کی یہ نشانی ہے کہ وہ پوشیدہ کو نکالتے ہیں اور سرگوشی کی خبر دیتے ہیں۔ میں مزید غور کروں گا۔''[۸]

حضرت حاطبؓ اور مقوقس کے اس مکالمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن اصحابؓ کو دوسری قوموں کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، ان کی تربیت کئی پہلوؤں سے کی۔ ایک پہلو یہ کہ جو صحابیؓ جس قوم کی طرف جائے اس کی زبان سے اچھی طرح واقف ہو، دوسرا یہ کہ اسے ان کے کلچر اور رسم ورواج سے بھی

واقفیت ہو، تیسرا یہ کہ وہ ان کے دین سے، جس کو وہ اختیار کیے ہوئے ہوں، آگاہ ہو اور چوتھا یہ کہ وہ اس سرزمین کے پورے جغرافیہ سے بھی مکمل واقفیت رکھتا ہو، تاکہ باہمی مکالمہ میں اسے ان معلومات کی بنا پر اپنے مخاطب پر علمی برتری حاصل رہے۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر محض ایک مثال پیش کی گئی ہے، اگر تمام نبوی سفراء کے احوال کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بین المذاہب مکالمے کے لئے کئی راہ نما اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔[۹]

اہلِ مغرب کے تحفظات پر مکالمے کا اسلوب

جو لوگ خدا، رسول اور آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوں ان کے ساتھ مکالمہ نسبتاً آسان ہے، اگرچہ اہل مغرب کا اب بھی چرچ کے ساتھ کم زور سا تعلق باقی ہے، لیکن ان کی اکثریت بالخصوص اہلِ یورپ عیسائیت کی بنیادی تعلیمات سے دست بردار ہو چکے ہیں، اس لئے مسلمان مبلغین کو مغرب میں تمام خرابیوں کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں ڈال دینی چاہیے، بلکہ ان کے ساتھ مکالمے میں ان کے موجودہ نظریات ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ موجودہ علمی اور فکری کشمکش میں اسلام کے ساتھ مکالمے کا اصل فریق اور مدِّ مقابل مغرب کا موجودہ دانش ور اور سیکولر طبقہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارا مکالمہ اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب ہم مغربی فکر وفلسفہ کے تاریخی ارتقاء، پسِ منظر اور اس کے اصل فکری سرچشموں سے آگاہی رکھتے ہوں اور ہم میں مغربی افکار کا تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت ہو۔ اس حوالے سے جن پہلوؤں پر خصوصی غور وفکر کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہیں:

ایک تو اس پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب مسیحیت کو چھوڑ کر موجودہ سیکولرزم تک کیوں اور کیسے پہنچا؟ ہمارے لئے اس تاریخی حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ سولہویں صدی عیسوی تک مغرب میں قدیم عیسائیت ہی غالب تھی، طاقت اور اختیار پوپ کے ہاتھ میں تھا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) (م ۱۵۴۶ء) پہلا شخص تھا جس نے پوپ کے اختیار کو چیلنج کیا اور ساتھ ہی عقلِ انسانی کو وحی کی تعبیر کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

یہی وہ دور ہے جس کے بعد مغربی معاشرے پر عیسائیت کی گرفت آہستہ آہستہ کم زور پڑنے لگی، لیکن جس فکر نے بالآخر عیسائیت کو مکمل پسپائی اور شکست پر مجبور کیا وہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پروان چڑھنے والی تحریکِ تنویر (Enlightenment Movement) اور تحریکِ رومانیت (Romanticism) ہے۔ مغرب کی موجودہ روشن خیالی کی تحریک کا یہ وہ مختصر پس منظر ہے جس کا پوری تفصیل کے ساتھ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا پہلو جس کا جائزہ لینا ضروری ہے وہ تحریکِ استشراق (Orientalism) ہے۔ اہلِ مغرب میں اسلام کے بارے میں پائی جانے والی ان بے شمار غلط فہمیوں کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک تحریکِ استشراق کے مقاصد، محرکات اور عالمِ مغرب پر اس کے اثرات کا بھرپور تجزیہ نہ کرلیں۔ بدقسمتی سے مستشرقین کی مرتب کردہ تاریخ نہ صرف زندہ ہے، بلکہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت بھی پوری دنیا میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اسلام کی جو تصویر کشی کی جارہی ہے اس کا بڑا ماخذ مستشرقین کی وہی تحقیقات ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب کے ساتھ باہمی مکالمہ کی صورت میں تیسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن و حدیث سے رہ نمائی تو ضرور لینی چاہیے، تاہم مغرب کی نفسیات کے مطابق ہمیں سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کے عقلی جواز پر بات کرنی ہوگی اور مغرب کے موجودہ سماجی علوم اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کے بعد اسلامی احکام کی افادیت پر دلائل پیش کرنے ہوں گے اور اسلامی تعلیمات کی سماجی اور معاشرتی اہمیت واضح کرنی ہوگی۔ اسلامی احکام کے اسرار وحِکَم پر حضرت شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' بڑی ہی قابل قدر ہے۔ موجودہ حالات کے پس منظر ہی اس موضوع کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مغربی اقدار اور اہلِ مغرب کے تحفظات

مغرب اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تحفظات رکھتا ہے وہ دو قسم کے

ہیں۔ پہلی قسم کے تحفظات تو وہ ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور نظامِ معاشرت سے ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ وہ حصہ ہے جس کا براہِ راست ٹکراو مغرب کے موجودہ طرزِ معاشرت سے ہے۔ دوسری قسم کے تحفظات وہ ہیں جن کا تعلق دین کی اساس اور بنیاد سے ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ اس وقت تک مفید نہیں ہوسکتا جب تک ہم کھلے ذہن اور مکمل تیاری کے ساتھ ان کے تمام تحفظات پر بات کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ سب سے پہلے ہمیں مغرب سے اس موضوع پر مکالمہ کرنا ہوگا کہ وہ دینِ اسلام پر ایک نظامِ حیات اور طرزِ معاشرت کی حیثیت سے غور کرے۔

انسانی حقوق اور اسلام

اس وقت مغرب میں مساوات، آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں بڑی حساسیت پائی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں یہ غلط تاثر پھیلا دیا گیا ہے کہ اسلام میں بنیادی انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا ہے۔ ہمیں اہلِ مغرب پر واضح کرنا ہوگا کہ اسلام تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے عطا کردہ حقوق ہی فطری بنیادوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً جب اسلام ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے تو کیا یہ حرمتِ انسان کا بہترین قانون قرار نہیں پائے گا؟ اسی طرح اسلام کی بیان کردہ تمام سزائیں بھی 'انسانی حق' کے اثبات ہی کے لیے ہیں۔ عورتوں کے حقوق میں بھی ان کے فطری دائرہ کار اور نفسیات کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔

ایک داعی کی حیثیت سے جو بات ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ یہ کہ اگرچہ انسانی حقوق کے عالمی منشور، (Universal Declaration of Human Rights) جو بجا طور پر آج کا عالمی قانون ہے، کی تمام شقوں کو قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، تاہم ہمیں اس بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لینا چاہیے اور اگر باہمی مکالمہ میں کسی جگہ لچک کی گنجائش موجود ہو تو اس کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے سیرت طیبہ ﷺ سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ

بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بین الاقوامی قانون، عرف اور قبائلی رسم ورواج کا احترام کیا۔ مثلاً جب آپؐ کا مسیلمہ کذّاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کروا دیتا۔[۱۰] دیکھئے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، لیکن آپؐ نے ان پر یہ حد جاری نہیں کی، بلکہ فرمایا کہ چوں کہ عالمی قانون یہ ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا، اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ میں تمہیں قتل کروا دیتا۔

سن ۹ ہجری میں اقرع بن حابسؓ کی زیر قیادت بنوتمیم کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا، لیکن ان لوگوں نے قبولِ اسلام کے لیے بڑی عجیب شرط لگائی کہ آپؐ پہلے ہمارے ساتھ مفاخرت کریں، آپؐ کا خطیب ہمارے خطیب کا اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر کا مقابلہ کرے، تب ہم اسلام قبول کریں گے۔ آپؐ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کیا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا مقابلہ کیا اور حضرت ثابت بن قیسؓ نے ان کے خطیب عطارد بن حاجب کا مقابلہ کیا۔ بنوتمیم نے بالآخر حضور ﷺ کے شاعر اور خطیب کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔[۱۱]

دیکھا جائے تو وفدِ بنی تمیم کا مطالبہ بالکل لایعنی تھا۔ بالفرض اگر مسلمانوں کا شاعر اور خطیب مقابلے میں شکست کھا بھی جاتے تو بھی اسلام کی حقانیت پر کوئی اثر نہ پڑتا، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ان کے رسم ورواج کا احترام کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کے ساتھ مکالمے کی اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ بنوتمیم نے جب قبولِ اسلام کی یہ عجیب وغریب شرط رکھی تو آپؐ نے بلا جھجک ان میدانوں میں ماہر اپنے اصحاب کو طلب کیا۔ اسی طرح جب آپؐ نے مختلف حکم رانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کرنے چاہیے تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! حکم رانوں میں یہ اصول ہے کہ وہ ان خطوط پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے

جن پر کوئی مہر (Seal) وغیرہ نہ ہو، چناں چہ اسی وقت آپؐ نے خطوط کو مُہر بند کرنے کے لیے مُہر بنانے کا حکم دیا۔۱۲

رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے کردار سے کون واقف نہیں؟ اس کی شر انگیزیوں کی وجہ سے اسلام کو کئی دفعہ نقصان اٹھانا پڑا۔صحابہ کرامؓ نے بارہا اس کے قتل کا ارادہ کیا، حتی کہ ایک دفعہ خود اس کے صاحب زادے، جو مخلص مومن تھے، نے بھی آپؐ سے اپنے باپ کے قتل کی اجازت طلب کی، لیکن آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو ایسے کسی بھی عمل سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کے قتل کا حکم دیتے ہیں۔اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبداللہ بن ابی سخت ترین سزا کا مستحق تھا لیکن آپؐ نے پھر بھی اس سے درگزر فرمایا، صرف اس وجہ سے کہ کہیں عام لوگوں کے ذہن میں اسلام کے بارے میں کوئی منفی تاثر پیدا نہ ہو جائے، گویا آپؐ کی نظر اصولی حکم کے نفاذ کے علاوہ اس کے نتائج اور عملی اثرات پر بھی تھی۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک داعی کے لیے نہ صرف عالمی قانون، رسم ورواج اور عرف سے واقفیت ضروری ہے، بلکہ اگر دعوت اور مکالمہ کے مثبت نتائج کی توقع ہو تو دیگر اقوام کے قوانین اور رسم ورواج کا ممکن حد تک لحاظ اور احترام بھی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر کسی اسلامی حکم کا نفاذ وقتی مصلحت کے خلاف ہو تو اس کے نفاذ میں توقف کیا جاسکتا ہے۔عصرِ حاضر میں مسلمان قانون دانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کا سیرتِ طیبہ ﷺ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور ان پہلوؤں کا جائزہ لیں جہاں باہمی گفتگو اور مکالمہ میں لچک کے پہلو کو مدنظر رکھا جاسکتا ہے۔

اسلام کا تصورِ جہاد

اسلام کے بارے میں اہلِ مغرب کو جو غلط فہمیاں ہیں ان میں سے ایک اس کا تصورِ جہاد ہے۔مدنی دور میں رسول اللہ ﷺ نے چھوٹی بڑی تقریباً ستاسی (۸۷) مہمات ترتیب دیں۔ان تمام مہمات کے مقاصد، محرکات اور اہداف مختلف تھے۔ان میں سے بعض انسدادی نوعیت کی تھیں تو بعض دفاعی تھیں، جب کہ بعض خالص دعوتی اور تبلیغی

نوعیت کی تھیں، لیکن محدثین اور مسلمان سیرت نگاروں نے ان تمام مہمات کو، جن میں ترتیب اور تنظیم کا معمولی سا بھی خیال رکھا گیا تھا، کتاب المغازی اور غزوات وسرایا کے عنوان سے ذکر کر دیا، جس سے اس غلط پروپیگنڈا نے جڑ پکڑی کہ اسلام جنگ وجدال کا دین ہے۔ مغرب میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے اور اگر اب بھی مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ بہ زورِ شمشیر اسلام کو تمام دنیا پر غالب کر کے دم لیں گے۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے حوالے سے اہلِ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ دو پہلوؤں سے ہونا چاہیے، پہلی بات تو ہمیں یہ واضح کرنا ہوگی کہ ابتدائی ایک دو صدیوں میں اسلام کے اسپین، وسطی ایشیا اور برصغیر تک پھیلنے کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات کی معقولیت اور مسلمان مبلغین کی انتھک کوششیں ہیں۔ دنیا کے کتنے ہی علاقے ایسے ہیں جہاں اسلامی فوجوں کا کبھی داخلہ نہیں ہوا، لیکن اسلام وہاں بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا پر بھلا کون سی اسلامی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں؟ لیکن کیا وہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں؟ اس لیے تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں اسلام کو دوسری اقوام پر ٹھونسنے کے لیے تلوار سے مدد لی گئی ہے۔

اس موضوع پر پروفیسر ٹی- ڈبلیو- آرنلڈ کی کتاب The Preaching of Islam ہمارے لیے بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے جہاد کے بارے میں ہم اسلامی نقطۂ نظر کو اہلِ مغرب پر پوری طرح واضح نہیں کر سکے۔ عام لوگ اب بھی اسی پرانی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیں اہلِ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام کے پھیلنے کے اسباب دیگر ہی ہیں۔ مثلاً ہمیں دلائل کے ساتھ بتانا ہوگا کہ بہت سے عیسائی، جن سے ابتدائی دور میں اسلام کا مکالمہ ہوا وہ بھی مسلمانوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے عقائد کی یکسانیت ابتدائی دور کے مسیحیوں کے قبولِ اسلام کا بڑا سبب بنی ہے، ڈاکٹر حمید اللہؒ (م ۲۰۰۲ء) لکھتے ہیں:

> ''نجاشی فرقہ طبیعتِ واحد کا (یعنی مانوفرائٹ) عیسائی تھا۔ اور ان دنوں اس فرقے اور یونان کے عیسائیوں میں بڑے سخت اختلافات تھے، آخر

الذکر اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ میں بہ وقت واحد دو طبیعتیں تھیں، انسانی اور خدائی بھی ۔ابرہہ جو (یمن میں) نجاشی کا نائب تھا، حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ نہیں بلکہ صرف مسیح اللہ مانتا تھا۔ غالباً نجاشی کے بھی یہی عقائد ہوں گے اور یہ مسلمانوں کے عقائد کے بہت مماثل ہیں''۔

اسی طرح روم اور ایران کے لوگوں نے قیصر وکسریٰ کی نسبت مسلمانوں کے عادلانہ اور سماجی مساوات پر مبنی اندازِ حکم رانی اور مناسب اور قانونی ٹیکسوں کے نفاذ کو خوش آمدید کہا اور یہی چیز ان کے قبول اسلام کا بنیادی سبب بنی۔

دوسرے، ہمیں اہل مغرب کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ جنگ انسانی نفسیات کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے دنیا کی ہر تہذیب میں جنگ بہ ہر طور موجود رہی ہے ۔ اہلِ مغرب، جو اس وقت امن کے سب سے بڑے داعی ہیں، ان کا موجودہ رویہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے ۔ اسلام نے انسانی نفسیات کے اس پہلو سے آنکھیں بند نہیں کیں، بلکہ انسان کے جنگی جنون کی تہذیب وتطہیر کرکے اس کو جہاد کے روپ میں پیش کیا ہے۔

اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود

اہلِ مغرب میں اسلام کے بارے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے مغرب سے مکالمہ میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ اور اس کے بعد کی اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان، ہندوستان اور عثمانی ترکوں کے دور میں ہمیشہ قرآنی اصول کے مطابق لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود ہمارے موقف کی واضح شہادت مہیا کرتا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کی اصولی تعلیم: لاَ إِكْـرَاهَ فِـيُ الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کی نظری اور عملی تبلیغ اور اشاعت کی جائے ۔ اس کے علاوہ عہدِ رسالت ﷺ، عہدِ خلافتِ راشدہ اور مسلم عروج کے ان تاریخی معاہدات سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے، جن میں مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

خلافت اور جمہوریت

اسلام کے سلسلے میں مغرب میں ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر مسلمان اقتدار میں آ گئے تو وہ پوری دنیا میں خلافت کا نظام نافذ کریں گے اور لوگوں کی شخصی آزادیاں اور حقوق سلب کر لیں گے۔ اسلامی نظامِ خلافت کے خلاف اہلِ مغرب کی اس غلط فہمی کی اصل وجہ اور پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مغرب کا وہ دور ہے جسے قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کہا جاتا ہے، جس میں پوپ ہی طاقت کا اصل سرچشمہ اور فائنل اتھارٹی (Final Authority) تھا۔ پوپ نے ہمیشہ اربابِ حل وعقد کا ساتھ دیا اور حکمرانوں کو مذہبی تحفظ فراہم کیا، دوسری طرف عوام کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ اصل میں مغرب نے اسلام کے نظامِ خلافت کو بھی یورپ کے دورِ تاریک میں اپنے ہاں پائی جانے والی مذہبی حکومتوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ مغرب نے صدیوں کی کشمکش کے بعد جو سیاسی اور شخصی آزادی حاصل کی ہے وہ اب اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مغرب پر یہ بات واضح کریں کہ اسلام کے تصورِ خلافت کو پاپائیت سے کوئی نسبت نہیں، کیوں کہ مسلمانوں کا خلیفہ عیسائیوں کے پوپ کی طرح خدا کا نمائندہ نہیں ہے، جس کی کسی بات کو نہ چیلنج کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ کسی اصول کا پابند ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) کو ایک شخص نے 'یاخلیفۃَ اللّٰہِ' (اے اللہ کے خلیفہ) کہا تو آپؓ نے فوراً اس کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں، بلکہ اس کے رسول ﷺ کا خلیفہ ہوں۔[۱۳] پوپ کے برعکس مسلمانوں کا خلیفہ خدا کے بجائے رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ ہے، جو مطلق العنان نہیں، بلکہ اصول کا پابند ہوتا ہے، جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور جو ایک خاص دائرے میں رہ کر ہی اپنے فرائضِ منصبی ادا کر سکتا ہے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خلفاء راشدین سے عام مسلمانوں نے نہ صرف اختلاف کیا، بلکہ بسا اوقات ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور

بھی کیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) نے جب مسلمان عورتوں کے لئے مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کرنا چاہی تو ایک خاتون نے ان کو برسرِ منبر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔[۱۴]

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان علماء نے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ عوام کے شانہ بہ شانہ مذہبی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑی ہے۔ پوری اسلامی تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) اور کتنے ہی جلیل القدر ائمہ نے وقت کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور اپنی جانوں تک کی پروا نہ کی۔ ہمیں مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ ہمارا ماضی ان کے ماضی سے بالکل مختلف ہے، اس لئے مغرب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں ہمارے روشن ماضی سے محروم کردے۔

اگر ہم اہلِ مغرب کو اس بات پر قائل کرلیں کہ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام انسانی سوسائٹی کے لیے زیادہ مفید اور بہتر ہے تو پھر شاید ہمارے لئے ان کے ان تحفظات کو دور کرنا مشکل نہیں ہوگا جن کا تعلق دین اور مذہب کی اساس سے ہے۔ اہلِ مغرب کے وہ تحفظات جن کا تعلق اسلام کے بنیادی اور اساسی تصورات سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

خدا کے وجود کا اثبات

یہاں بھی ہمیں اہلِ مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اس ماحول کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جس میں مغربی ذہن پروان چڑھتا اور شعور کی منازل طے کرتا ہے۔ اہل مغرب، جو ہر چیز کو عقل (Reason) کی بنیاد پر پرکھنے کے عادی ہیں، ان کے سامنے خدائی کتاب کی بنیاد پر اپنے دلائل شروع کرنے سے پہلے خود خدا کے وجود کو زیر بحث لانا ہوگا، ورنہ مغرب کی خطرناک حد تک آزاد سوچ ہمیں غیر سنجیدہ قرار دے گی۔ سائنسی امکان اور عقل کی بنیاد پر اگر خدا کے وجود کے لیے فطرت کے مشاہدے پر زور دیا جائے تو

شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو، جیسا کہ مکی عہدِ نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ کو عقل اور مشاہدۂ فطرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف متوجہ کیا تھا۔

کیا اسلام عیسائیت اور یہودیت کی نئی صورت گری ہے؟

مغرب میں اسلام کے بارے میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص کے ذہن میں بھی یہ تصور راسخ ہے کہ اسلام کوئی مستقل دین نہیں، بلکہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا نیا روپ ہے۔ اس خیال کی ترویج میں بنیادی کردار تحریکِ استشراق کا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور عیسائی عالم یوحنا دمشقی (John of Damascus) کو تحریکِ استشراق کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے 'محاورۃ مع المسلم' اور 'ارشادات النصاریٰ فی جدل المسلمین' نامی کتب سے اسلام کے خلاف جس منفی پروپیگنڈے اور قلمی مناظرے کا آغاز کیا تھا، مغرب میں اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے اپنی قابل قدر تصنیف 'ضیاء النبی ﷺ' کی چھٹی اور ساتویں جلد میں تحریکِ استشراق کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اہلِ مغرب، جو سماجی، معاشرتی اور سائنسی علوم کی معراج کو پہنچے ہوئے ہیں، ان کے نزدیک آج بھی اسلام کے بارے میں نہ جاننا کم علمی کی دلیل نہیں ہے۔ مغرب میں یہ تاثر اب بھی عام ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت ہی کی مسخ شدہ تعلیمات پر مبنی ہے اور اسلامی قوانین یہودیوں کی فقہ 'تالمود' سے اخذ شدہ ہیں، جن کا زیادہ زور ان کے ظاہری الفاظ پر ہے نہ کہ مقاصد پر۔ جوزف شاخت (Josefh Schacht) نے اپنی کتاب The origins of Muhammadan Jurisprudence میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے۔ مشہور مستشرق ول ڈیورانٹ (Will Durant) (م ۱۹۸۱ء) نے اپنی کتاب The Age of Faith میں، فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) نے اپنی کتاب Islam and the We st میں اور موریس سیل (Morris S. Seale) نے اپنی کتاب Muslim Theology میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن وحدیث کا بڑا حصہ یہودی اور عیسائی روایات

سے ماخوذ ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ سے اہل مغرب کی اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

قرآن وحی الٰہی ہے

رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے انکار کی وجہ سے مغرب میں قرآن کو آسمانی صحیفے کے بجائے محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔اس غلط فہمی کی بڑی وجہ بھی ماضی کا پروپیگنڈا ہے جس کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔اگر چہ گذشتہ کئی صدیوں سے کئی یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا جارہا ہے، لیکن ان تراجم کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مترجمین کے پیش نظر اسلام کا تعارف کرانے کی نسبت مسیحی جنگ جوؤں کو مقدس جنگ (Sacred War) کے لیے مسلمانوں کے خلاف تیار کرنا تھا۔بعد کے دور میں قرآن مجید کے تراجم میں یہی اسلوب کسی نہ کسی انداز میں غالب رہا ہے۔اسی پروپیگنڈے کے زیر اثر مسلمانوں کو محمڈن (Muammadan) پکارا گیا اور اسی سے محمڈن لا (Muhammadan Law) کی اصطلاح وجود میں آئی۔

قرآن مجید ہر دور کے لیے نبی کریم ﷺ کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔عہدِ رسالت میں بھی لوگوں نے قرآن مجید کو جب حضور ﷺ کی اختراع قرار دیا تو آپؐ نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوبِ بیان اور ہر قسم کے تناقض سے مبرّا ہونے کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔عقل پرستی کے موجودہ دور میں قرآن مجید کا معجزانہ پہلو اس کی فطری تعلیمات کے علاوہ وہ سائنسی اور تاریخی حقائق ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآنِ مجید کے اس پہلو پر توجہ دیں اور اہلِ مغرب کو یہ بتائیں کہ کتنے ہی ایسے تاریخی اور سائنسی حقائق ہیں جن تک مغرب صدیوں کی محنت اور تجربات کے بعد پہنچا ہے، لیکن قرآنِ مجید نے صدیوں پہلے ان حقائق کو بیان کر دیا۔یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کسی انسان کا نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ڈاکٹر موریس بوکائے کی کتاب The Bible,The Quran and Science

اوراس کے بعد اس موضوع پر شائع ہونے والی دیگر کتب اس ذیل میں ہماری توجہ کی خصوصی مستحق ہیں۔

اہلِ مغرب میں اعلیٰ ترین سطح پر اب یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ مذہب سے مکمل دست برداری ان کے معاشرتی اور تہذیبی زوال کا باعث بن رہی ہے اور موجودہ مغربی فلسفہ ان کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس وقت اہلِ مغرب جو روحانی خلا محسوس کر رہے ہیں اس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فی الوقت مغربی سیکولرزم کو ایک خاص مفہوم میں بحران کا سامنا ہے۔ آج کی عالمی صورتِ حال میں مذہب ایک بار پھر اہلِ مغرب کی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو رہا ہے۔۱۵ اس لیے مسلمان اہلِ علم کے لیے یہ مناسب وقت ہے کہ وہ اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کو بہتر انداز میں پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مغرب کی نفسیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اسلام کو آج کے جدید اسلوب، تکنیک اور زبان میں پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اپنی فطری تعلیمات کی وجہ سے مغرب کے اعلیٰ ذہن کو متاثر نہ کرے۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے رجالِ کار کی تیاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ اسلام کی اشاعت کا تمام انحصار دعوت وتبلیغ اور دوسری قوموں سے مکالمے پر ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف بین المذاہب مکالمے کی عملی مثال قائم کی، بلکہ ایسے افراد بھی تیار کیے جو دوسری قوموں سے مکالمے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب جب کہ حالات کے جبر نے ہمیں بین المذاہب مکالمے کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے، ہمارے پاس ایسے افراد کی شدید کمی ہے جو مغربی فکر وفلسفہ پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہوں اور جو اہلِ مغرب کی ذہنی ساخت، ان کی نفسیات، پسِ منظر اور تکنیک سے واقف ہوں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ علمی رسوخ رکھتے ہیں وہ مغربی زبان وادب اور مغرب کی نفسیات سے واقف نہیں اور جو لوگ مغربی زبان اور محاورے کو جانتے ہیں وہ علمی طور پر کم زور ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اور جامعات کے نصابِ تعلیم میں مغربی

فکر وفلسفہ کو بہ طور لازمی مضمون کے شاملِ نصاب کیا جائے ،تاکہ ایسے رجالِ کار کی تیاری ممکن ہو جو مغرب کے دانش ور طبقے سے پورے اعتماد کے ساتھ بات کرسکیں ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یونانی فکر وفلسفہ کے عروج کے دور میں مسلمان اہلِ علم نے یونانی علم کلام اور فلسفہ پر مکمل عبور حاصل کیا تھا اور پھر یونانی فکر وفلسفہ کے علمی اور تحلیلی جائزے کے بعد اسلامی فکر کی برتری کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا تھا۔ دورِ حاضر میں مسلمان اہل علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ کو دہراتے ہوئے جدید علم کلام اور مغربی فکر وفلسفہ پر عبور حاصل کریں ،تاکہ مغربی فکر کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر اس کی کم زوریوں اور کھوکھلے پن کو واضح کیا جاسکے۔

ایک اور چیز جس کا ہمیں خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیے وہ یہ کہ مغرب کے ساتھ مکالمہ میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ اور دفاعی کے بجائے اقدامی ہونا چاہیے۔ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کی ایسی تاویل سے اجتناب کرنا چاہیے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔معروف روایت کے مطابق جب قریشی وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے سامنے مختلف متبادل (Options) رکھے کہ آپؐ جو پیش کش بھی چاہیں قبول کرلیں، مگر دعوت وتبلیغ سے باز آجائیں تو آپؐ نے اس وقت جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہ ذہنی مرعوبیت کے شکار لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔آپؐ نے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے پیچھے ہٹنے والا نہیں''۔۱۶ اسی طرح جب شاہِ حبشہ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا، تاکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور عیسائی مذہب کے بارے میں اپنا موقف بیان کریں ،تو مسلمانوں سخت پریشان ہوئے ، کیوں کہ سچ کہنے کی صورت میں نجاشی اور درباریوں کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا ،لیکن آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت کے بعد یہ متفقہ فیصلہ کیا:

نقول و اللّٰہ ماقال اللّٰہ و ماجاء نابہ نبینا. ۱۷	اللہ کی قسم، ہم وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے جس کی تعلیم دی ہے۔

اس لیے ہمیں کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام ہی ایک ایسا تریاق ہے جو مغرب کی تہذیب کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے زندہ جاوید کر سکتا ہے۔ مغرب کے تمام مسائل، خاندانی نظام کی شیرازہ بندی، بچوں میں بڑوں کا احترام پیدا کرنا، باہمی اخوت، نسلی تفاخر کا خاتمہ، نفسیاتی استحکام، احترامِ آدمیت، تحمل، ایڈز جیسی بیماریوں کے خلاف سماجی مدافعت وغیرہ کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔

حواشی ومراجع

۱ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۹۱/۴

۲ مسند احمد، حدیث زید بن ثابتؓ، ۱۱۰۸، ۶/ ۲۳۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۱ء

۳ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، ۲۲۷۷

۴ سرخسی، المبسوط، کتاب الصلوٰۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۸ء، ۳۷/۱

۵ ڈاکٹر حمید اللہ، صحیفہ ہمام بن منبہ، ناشر رشید اللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۳

۶ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵ء، ۳۵۱/۳

یہاں ضمناً ایک اور بات کا ذہن نشین رہنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں اسلام کی امن پسندی پر استدلال کے لئے صلح حدیبیہ کا حوالہ جس انداز سے دیا جاتا ہے اس سے اس عظیم تاریخی واقعے کی حیثیت محض ایک منفی سمجھوتے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے، حالاں کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ یک دم وقوع پذیر نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کو بھی اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۶ ھ سے قبل کے واقعات اسلام کے متعلق ہر قسم کے مفعولی تاثر کو ختم کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں صلح کا معاہدہ مسلمانوں سے زیادہ خود قریش کی ضرورت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں سے مشہور بیعت 'بیعتِ رضوان' لی اور مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو گئے تو قریش نے عافیت اسی میں جانی کہ صلح کے موقع کو ضائع نہ کیا جائے۔ تاہم آپؐ نے جن شرائط پر صلح کی اس سے آپؐ کی امن پسندی کا واضح

ثبوت ملتا ہے۔

۷ ابنِ الاثیر الجزری، اسد الغابۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱/۳۶۲

۸ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء، ۳/۶۹۱، ۶۹۲

۹ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو: صحابہ کرام کا اسلوبِ دعوت وتبلیغ، ناشر، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۷۷۔ ۱۸۷

۱۰ مسند احمد، ۱/۴۶۵، ح: ۳۷۵۲، حدیث عبداللہ بن مسعود

۱۱ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۱/۲۳۲، ذکر نقش خاتم رسول اللہ ﷺ

۱۲ ڈاکٹر حمید اللہؒ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دار الاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۷

۱۳ ابویعلیٰ، الاحکام السلطانیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۷

۱۴ ابن العربیؒ، احکام القرآن، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۱/۴۶۹، تفسیر آیت: وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً (النساء:۲۰)

۱۵ اس حوالے سے پروفیسر میاں انعام الرحمٰن کا تجزیاتی مضمون جو ماہنامہ 'الشریعۃ' گوجرانوالہ، اگست ۲۰۰۵ء میں ''مغرب کی ابھرتی ہوئی مذہبی شناخت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، قابل مطالعہ ہے۔

۱۶ ابن کثیرؒ، البدایۃ والنہایۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۳/۶۶

۱۷ سیرت ابن ہشام، ۱/۳۷۳

☆☆☆

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

تعارف وتبصرہ

ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں (جلد سوم) پروفیسر کبیر احمد جائسی

ناشر: ادارۂ قرطاس، پوسٹ بکس نمبر: ۸۴۵۳، کراچی (پاکستان)، ۲۰۱۰ء، ص ۲۴۴، قیمت -/۲۰۰ روپے

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی شہرت علمی دنیا میں ایرانی وتاجیکی ادبیات کے عالم اور محقق کی حیثیت سے ہے۔ انھیں فارسی زبان وادب میں خدمات کی بنا پر صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ (۱۹۹۴ء)، ایرانی حکومت کے سعدی ایوارڈ (۲۰۰۸ء) اور دیگر اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے چیرمین اور ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔ عمر کے آخری مرحلے میں انھوں نے ایران میں فارسی زبان میں تفسیر نویسی کی تاریخ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا یہ منصوبہ ان شاءاللہ چار جلدوں میں مکمل ہوگا، جس کی تیسری جلد پیش نظر ہے۔

کتاب کی پہلی جلد چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کی اہم دستیاب تفاسیر کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا طبری (م ۳۱۰ھ) کی مشہور تفسیر کے فارسی ترجمے سے کی گئی ہے اور خاتمہ عمادالدین اسفرائینی (م اواخر پانچویں صدی ہجری) کی تفسیر تاج التراجم پر ہوا ہے، دوسری جلد چھٹی صدی ہجری کی اہم تفاسیر، مثلاً تفسیر سورآبادی، تفسیر نسفی، کشف الاسرار اور روض الجنان فی تفسیر القرآن کے مطالعات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد میں گیارہویں صدی ہجری تک کی اہم تفاسیر، مثلاً اسرار الفاتحہ، حدائق الحدائق، تفسیر شاہی، منہج الصادقین اور تفسیر لاہیجی کا تعارف وتجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ہر تفسیر کے ضمن میں فاضل مصنف نے پہلے اس کے زمانۂ تالیف کے سیاسی، سماجی اور علمی حالات پر روشنی ڈالی ہے، مفسّر کے احوال زندگی بیان کیے ہیں۔ پھر اس تفسیر کے اقتباسات مع ترجمہ نقل کیے ہیں۔ یہ اقتباسات اگرچہ طویل ہیں، لیکن ان سے مفسّر کے رجحان طبع اور کتاب کے اسلوب اور اندازِ بحث کا بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کی آخری چوتھی جلد حسب منصوبہ چودھویں صدی ہجری تک ایران

کی فارسی تفسیروں کے مطالعہ پر مشتمل ہوگی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مصنف کو توفیق و طاقت عطا فرمائے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

فیضانِ رسالت — مولانا غلام محمد منصوری

ناشر: المنار پبلشنگ ہاؤس، N-5B، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰۲، قیمت: -/۲۲۰ روپے

زیر نظر کتاب احادیثِ رسول کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔ اس کے مرتب مولانا غلام محمد منصوری کویت میں مقیم اردو داں طبقہ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہاں انھوں نے عرصہ تک وزارت اوقاف میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیے ہیں اور واعظِ دینی برائے مسلمانانِ ہندو پاک کی حیثیت سے اپنے مواعظ و دروس سے مستفید فرماتے رہے ہیں۔ ریڈیو کویت کی اردو نشریات سے کئی سال تک 'بہترین قول' کے عنوان سے روزانہ ان کا درسِ حدیث نشر ہوتا رہا۔ تقریباً پانچ ہزار احادیث کا ترجمہ اور تشریح نشر ہو چکی تھی کہ کویت پر عراقی حملہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور بعد میں بعض موانع کی وجہ سے پھر بحال نہ ہوسکا۔

اس کتاب میں علم کی فضیلت و اہمیت، علماء کی حیثیت و ذمہ داری، فضائل قرآن، ایمان کی فضیلت وحقیقت، مومنانہ اوصاف اور منافقانہ اعمال کے موضوعات پر پچھتر (۷۵) احادیث ترجمہ اور مختصر تشریح کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ احادیث کے انتخاب میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ وہ صحیح اور مستند ہوں اور ان کی تشریح سہل، عام فہم، جدید ذہن کو اپیل کرنے والی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ مقدمہ میں فاضل مرتب نے فتنۂ انکارِ حدیث کی خطرناکی واضح کی ہے اور دین پر پڑنے والے اس کے اثرات سے آگاہ کیا ہے۔ کتاب پر مولانا محمد فاروق خاں معروف ہندی مترجم قرآن وسابق صدر ادارۂ تحقیق کی 'تقریظ' ہے، جس میں انھوں نے اس موضوع پر مدلل بحث کی ہے کہ سنت کی پیروی کیوں ضروری ہے؟

امید ہے، اس مجموعۂ حدیث کو دینی حلقوں میں قبول عام حاصل ہوگا اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا۔ (م-ر)

قطعِ حیات بہ جذبۂ رحم کی شرعی حیثیت ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

ناشر: سلیمان اکیڈ بی، بھتورا، مدھوبنی، بہار، ۲۰۱۰ء، صفحات: ۱۲۸، قیمت -/ ۸۰ روپے

اگر کوئی شخص کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہوکر بالکل معذور ہوجائے اور معمول کی زندگی گزارنے کے لائق نہ رہے، بلکہ اس کی زندگی خود اس کے لیے بوجھ بن جائے، یا اس کے رشتہ دار اسے بوجھ سمجھنے لگیں، تو کیا اسے یا اس کے رشتہ داروں کو اس کی زندگی ختم کرنے کا حق حاصل ہے؟ موجودہ دور کا یہ ایک اہم سماجی اور طبی مسئلہ ہے۔ اصطلاح میں اسے EUTHANASIA کہا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اپنے سولہویں فقہی سمینار منعقدہ دارالعلوم مہذب پور اعظم گڑھ میں جن موضوعات پر بحث ومباحثہ کیا، ان میں اسے بھی شامل کیا۔ زیرِ نظر مقالہ اصلاً اسی سمینار کے لیے لکھا گیا تھا۔ عمومی افادیت کے پیش نظر اب اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد شمیم اختر نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس کے بعد دوسال بہ حیثیت محقق ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ان کے علمی مقالات ملک و بیرون ملک کے موقر تحقیقی مجلّات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں یوتھینیز یا کی حقیقت، تاریخ، قسمیں، علاج معالجہ کی شرعی حیثیت، اس سلسلے میں ڈاکٹر کی ذمہ داری اور شرعی اعتبار سے یوتھینیز یا کے نادرست ہونے کی وجوہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے قرآن وحدیث کے علاوہ فقہ کے اہم مراجع سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کے حوالے سے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے، جس میں انھوں نے مصنف کی کاوش کو سراہا ہے۔

کتاب کی پیش کش کو مزید بہتر بنانے کے لیے چند مشورے درج ذیل ہیں:

۱- قطع حیات بہ جذبۂ رحم کی تاریخ (عالمی اور ملکی سطح پر) کے ضمن میں جو معلومات کتاب کے شروع میں بیان کی گئی ہیں وہ مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب

'صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات' سے ماخوذ ہیں۔ مولانا کی یہ تحریر سب سے پہلے سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی اپریل-جون ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا نے یہ معلومات ۱۹۸۶ء کے بعض اخبارات سے حاصل کی تھیں۔ ربع صدی کے بعد اس موضوع پر شائع ہونے والی کتاب میں یہ معلومات UP TO DATE ہونی چاہیے تھیں۔

۲- کتاب کی کچھ بحثیں اصل موضوع سے بہ راہ راست متعلق نہیں، بلکہ تمہیدی ہیں، مثلاً پرورش اولاد کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے عزل کا جواز؟، علاج معالجہ کی اہمیت، عیادت، بیماری پر صبر، علاج میں محرمات سے استفادہ؟، ناپاک اشیاء سے بنی دوا کا حکم، خودکشی کی حرمت وغیرہ۔ یہ تمام بحثیں بھی مولانا عمری کی کتاب میں موجود ہیں۔ چوں کہ یہ بحثیں مصنف کے موضوع سے بہ راہِ راست متعلق نہیں ہیں، اس لیے ان سے تعرّض نہ کیا جاتا یا اختصار سے کام لیا جاتا تو بہتر تھا۔

۳- زیرِ نظر کتاب کے اصل موضوع پر بھی مولانا عمری نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے۔ مصنف نے اس سے استفادہ کیا ہے اور جا بہ جا اس کے حوالے دیے ہیں۔ اس موضوع پر مولانا عمری نے کچھ بحث اپنی دوسری کتاب 'اسلام اور مشکلاتِ حیات' میں بھی کی ہے۔ اس کا تذکرہ 'کتابیات' میں نہیں ہے۔ شاید اس تک مصنف کی رسائی نہیں ہوسکی۔ اسے بھی دیکھ لیتے تو بہتر تھا۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر بھرپور معلومات پیش کرتی ہے اور اس سے شرعی نقطۂ نظر کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔ امید ہے، علمی حلقوں میں اسے قبول عام حاصل ہوگا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (م-ر)

انتہا پسندی اور اس کا تدارک حافظ محمد ابراہیم عمری

ناشر: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، عمرآباد، ویلور، تامل ناڈو، ۲۰۱۰ء، صفحات ۲۴۰

اسلام اعتدال اور میانہ روی کا حامل دین ہے۔ اس میں عیسائیت کی طرح رہبانیت ہے نہ دیگر مذاہب کی طرح غلو پسندی۔ اسلام کی حامل امت کو 'امّت وسط' اور 'خیر امت' کے القاب سے نوازا گیا ہے اور اس میں بے اعتدالی اور غلو پسندی کے لیے

قطعاً گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں شریعت کی معتدل مزاجی اور نرم پسندی پر گفتگو کی گئی ہے۔ باب اوّل میں غلو کا مفہوم اور قرآن و حدیث میں اس کی شناعت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں چھ فصلیں ہیں، جن کے تحت زندگی کے مختلف پہلوؤں میں غلو پسندی کے مظاہر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فصل اوّل میں اعتقادی مسائل پر بحث ہے، جو نہایت اہم ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات ،محبت رسول ، وسیلہ اور تقرب کے لیے اولیاء اللہ سے استعانت، شناعت کا غلط تصور، زیارتِ قبور، نیز اولیاء اللہ سے بے جا عقیدت جیسے موضوعات شامل ہیں۔ بقیہ فصلیں دینی ،سیاسی ،معاشی اور معاشرتی مسائل میں غلو سے بحث کرتی ہیں۔ چھٹی اور آخری فصل انفرادی مسائل سے متعلق ہے۔ اسی طرح باب سوم میں انتہا پسندی کے اسباب اور ابواب چہارم وپنجم میں اس کے نقصانات اور ان کے تدارک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ ایک عام موضوع پر خاص کتاب ہے، جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں دین وشریعت کے اصل مزاج یعنی اعتدال وتوازن اور نرمی وآسانی کو پیش کیا گیا ہے اور اس تعلق سے عوام میں رواج پاجانے والے غلو، انتہا پسندی اور بدعات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

کتاب کی پیش کش کو بہتر بنانے کے لیے دو باتیں بہ طور مشورہ عرض ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ کتاب جامعہ دارالسلام عمر آباد کے تحقیقی ادارے سے شائع ہوئی ہے، مگر اس میں علم وتحقیق کی دنیا میں معروف روایات کا پاس ولحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ یعنی نقل واقتباس کے ضمن میں مصنف، کتاب، سنہ اشاعت، مطبع اور صفحہ نمبر وغیرہ درج کرنے کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ تقریباً تمام ہی حوالے ناقص ہیں۔ آخر میں مراجع ومصادر کی فہرست بھی شائع کی جانی چاہیے تھی۔

دوسری بات اس کتاب کے نام سے متعلق ہے۔ آج کل، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، 'انتہا پسندی' ایک مخصوص اصطلاح بن گئی ہے، جس کا استعمال اُن لوگوں کے لیے کیا جاتا

ہے جو دین وشریعت پر مضبوطی سے قائم ہیں یا قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس لیے کتاب کا نام ان مضامین کا احاطہ نہیں کرتا جن پر یہ مشتمل ہے۔اگر اس کا نام 'اسلام میں غلو پسندی اور اس کا علاج' یا اس طرح کا کوئی اور نام ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ (جاوید احسن فلاحی)

مدارسِ اسلامیہ کی دینی و دعوتی خدمات ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی

ناشر: ادارۂ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی)، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۲، قیمت: -/۷۰ روپے

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر لگائے جانے والے الزامات میں سے اس الزام کو بھی خوب ہوا دی گئی کہ دینی مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں، یہاں سماج میں فتنہ وفساد اور قتل وغارت گری کے لیے نئی نسل کی ذہن سازی ہوتی ہے، بہ الفاظ دیگر یہاں دہشت گردی کی نرسری تیار کی جاتی ہے۔زیر نظر کتاب اس الزام کا خاموش جواب فراہم کرتی ہے۔

شمالی ہند کی مشہور درس گاہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ میں فروری ۲۰۰۵ء میں ایک بین الاقوامی مذاکرہ 'دعوتِ اسلامی اور مدارسِ دینیہ' کے موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ اس میں فاضل مصنف نے جو مقالہ پیش کیا تھا اسی کو بعد میں مناسب تدوین اور ضروری اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

باب اول میں مدرسہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں فاطمی اور سامانی حکم رانوں کے قائم کردہ مدارس، نظام الملک طوسی اور نورالدین زنگی کی خدمات، ہندوستان میں مسلم حکم رانوں کے ذریعے دینی تعلیم کے فروغ کی کوششوں اور مختلف ممالک میں مدرسہ سسٹم کا تعارف کرایا گیا ہے۔بعد کے چھ ابواب میں دارالعلوم دیوبند، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج کا تذکرہ تفصیل سے اور بعض دیگر مدارس کا تذکرہ اختصار سے کیا گیا ہے اور ان کی دینی ودعوتی خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے۔فاضل مصنف کو احساس ہے کہ ''ہر مکتب فکر کے دیگر متعدد ادارے ایسے ہیں جو ہندوستان میں ممتاز اور اپنی خدمات کے اعتبار سے منفرد ہیں، مگر صفحات کی تنگی، وقت کی محدودیت اور مکتب فکر کی

یکسانیت نے ان کے جائزے سے محروم رکھا ...اس دعوتی و دینی تجزیہ میں شیعہ مکتب فکر کی ترجمانی بھی نہیں ہوسکی ہے‘‘۔(ص ۷-۸)

کتاب کے آخری باب میں فاضل مصنف نے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد سے کچھ شکوے کیے ہیں اور انھیں خود احتسابی کی دعوت دیتے ہوئے ان کی خدمت میں کچھ مشورے پیش کیے ہیں۔مثلاً یہ کہ غیر مسلموں سے تال میل رکھا جائے،حکمت و بصیرت اور فراست کے ساتھ مدارس کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں دور کی جائیں، جدید حالات، بدلتے رجحانات اور نئے افکار ونظریات سے واقفیت رکھی جائے، مسلکی عصبیت اور کشاکش سے اجتناب کیا جائے اور شورائی مزاج کو فروغ دیا جائے وغیرہ۔ یہ مشورے اس قابل ہیں کہ ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور انھیں مدرسہ سسٹم میں نافذ کیا جائے۔

امید ہے، دینی حلقوں میں اس کتاب کو پذیرائی حاصل ہوگی اور خاص طور سے ذمہ داران مدارس اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (م-ر)

تاریخ افغانستان وشیشان (چیچنیا) کلیم صفات اصلاحی

ناشر: البدر بک سینٹر، سرائے میر، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۶، قیمت -/۱۰۰ روپے

افغانستان اور چیچنیا عصر حاضر میں مسلم اکثریت کے دو ایسے علاقے ہیں جہاں کے جیالوں نے حرّیت، جہاد اور شہادت کی تاریخ رقم کی ہے۔ انھوں نے دنیا کی دو سُپر پاورس سے لوہا لیا ہے اور انھیں ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ اگرچہ بہ ظاہر وہ شکست سے دوچار ہوئے ہیں اور ان کی سیاسی وعسکری قوت پارہ پارہ ہوگئی ہے، لیکن دنیا نے ان کی اخلاقی ومعنوی فتح تسلیم کی ہے اور ان کی غیرت وحمیّت ، اولوالعزمی، حریت پسندی اور غیروں کی غلامی سے نفرت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان دونوں علاقوں کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاریخ افغانستان کے ضمن میں وہاں کی قدیم تاریخ، افغانیوں کا نسب، لفظ ’پٹھان‘ کی اصل، ان کے قبائل، ان کا قبول اسلام، افغانستان میں غیر افغانیوں کی

حکومت، عہد بہ عہد افغانستان کے سیاسی انقلابات کے ساتھ اس کے جغرافیائی حالات، روس، برطانیہ اور ہندوستان سے تعلقات، روس کی فوجی مداخلت، افغانیوں کی مزاحمت اور روسی تسلّط سے آزادی، طالبان حکومت کے قیام وسقوط کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اب تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا ہے اور امریکی حملے کے اسباب ومحرکات اور استعماری مقاصد، کرزئی حکومت اور اس کی پالیسیوں اور طالبان کے ظہور ثانی کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے سیاسی حالات اور تبدیلیوں کے ساتھ افغانستان کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ چیچنیا کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اس میں چیچنیوں کی قومی خصوصیات، مذہبی و تمدنی حالات، روسی استعمار کے مظالم، مسلمانوں کی جلا وطنی اور مراجعت، اعلانِ خودمختاری اور مسلّح جدوجہد کی تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بہت مختصر ہے۔ (۱۶۶ر صفحات کی کتاب میں صرف ۲۱ر صفحات اس کے لیے مختص ہیں) بہتر ہوتا کہ چیچنیا کے بارے میں مزید معلومات فراہم کر کے اس حصہ کو مستقل کتاب کی حیثیت دے دی جاتی۔

اس کتاب کے مصنف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے رفیق ہیں اور کتاب کا اکثر حصہ اس کے ترجمان ماہ نامہ معارف میں شائع ہوچکا ہے۔ تاریخی موضوعات پر رفقائے دارالمصنفین کو اعتبار و استناد حاصل ہے۔ امید ہے، اس کتاب کی بھی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ (م-ر)

مجلّہ 'الأخبار' بھٹکل - فلسطین نمبر مدیر: محمد ناصر سعید اکرمی

ناشر: معہد امام حسن البنا شہید، مدینہ کالونی، پوسٹ بکس نمبر ۱۳، بھٹکل، جلد: ۴، شمار: ۱، جون ۲۰۱۰ء، ص ۲۴۸ (بڑی تقطیع)

فلسطین کے موجودہ حالات دنیا کے ہر مسلمان کا دل تڑپا دینے کے لیے کافی ہیں۔ ظالم و غاصب صہیونیوں نے مسلمانانِ غزہ کا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور ان پر ہر طرح کے ظلم وجبر کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ یہ فتنہ انگیزیاں ان کے عالمی منصوبہ کا حصہ ہیں، جس کے مطابق وہ وہاں کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے مسلسل یہودی بستیاں بسا رہے

ہیں اور مسلمانوں کے قبلۂ اول مسجد اقصیٰ کو خدانہ خواستہ منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی خواہش ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہی ہے۔افسوس کہ فلسطین کے اطراف کے عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک کے حکم راں خوابِ خرگوش میں مست ہیں، یا حقیقت کا ادراک رکھنے کے باوجود ان پر جمود اور بے بسی طاری ہے اور دنیا کے مسلمانوں کو بھی بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کی اہمیت وفضیلت، مسئلہ کی حقیقی نوعیت اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمی طاقتوں کی سازشوں، ریشہ دوانیوں، مکّاریوں اور عیّاریوں کا علم نہیں ہے۔ضرورت تھی کہ فلسطین کے تعلق سے مسلمانوں میں بیداری لانے کی کوشش کی جائے۔زیرنظر خصوصی شمارہ اس سلسلے میں ایک کامیاب،مفید اور راست اقدام ہے۔

جنوبی ہند کے علمی وتاریخی شہر بھٹکل میں قائم ادارہ معہد امام حسن البنا شہید گزشتہ چند سالوں سے مفید دینی وعلمی خدمات انجام دے رہا ہے۔عوام کی دینی رہ نمائی کے لیے ایک عمدہ لائبریری کا قیام، وقتاً فوقتاً ممتاز اصحاب علم کے توسیعی خطبات کا انعقاد، مختلف اسلامی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت اور عصرِ حاضر کی عظیم اسلامی تحریک الاخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البنا شہید کے افکار کو عام کرنے کے لیے شش ماہی مجلّہ الأخبار کا اجراء اس کی خدمات کے چند نمایاں عناوین ہیں۔امام حسن البنا شہید کو مسئلہ فلسطین سے خصوصی دل چسپی تھی۔انھوں نے اپنے خطبات میں اس مسئلے پر پُر زور الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے اور مسلم حکم رانوں اور بین الاقوامی اداروں کو اس جانب متوجہ کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ان کی تحریک 'الاخوان المسلمون' کے پرعزم جوانوں نے جہاد فلسطین میں عملاً شریک ہو کر اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا ہے۔اس وقت فلسطین میں سرگرم تحریک 'حماس' حقیقت میں اخوان ہی کی ایک شاخ ہے۔اس تعلق سے معہد کے ذمہ داروں نے مسئلہ فلسطین پر مسلمانوں میں بیداری لانے کے لیے ایک پروگرام ترتیب دیا، جس کا ایک جز زیرنظر خصوصی اشاعت ہے۔

یہ خصوصی شمارہ عربی، انگریزی اور کنڑ زبانوں میں ایک ایک مضمون کے علاوہ اردو میں اداریہ (بہ عنوان: فلسطین ہمارے دلوں کی دھڑکن)، بائیس منظومات اور پچاس

سے زائد مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کے ذریعے موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں پر بھرپور اور قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ متعدد مضامین میں مسئلہ کی نوعیت واضح کی گئی ہے۔ کئی مضامین میں قرآن کریم اور بائبل کی روشنی میں ارض مقدس کی اہمیت کا بیان ہے اور یروشلم اور مسجد اقصیٰ پر یہود کے موروثی عقیدہ اور دعویٰ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کئی مضامین تاریخی نوعیت کے ہیں، ان میں بیت المقدس، مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کی مختصر تاریخ، حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد خلافت میں فتح بیت المقدس کے بعد وہاں ان کے سفر اور یہود کے ساتھ تاریخی معاہدہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالاتِ حاضرہ سے متعلق متعدد مضامین ہیں، جن میں مسئلہ فلسطین پر عالمی سیاست کی بازی گری اور عالم اسلام کی سرد مہری، القدس پر یہودی تسلط کی حکمت عملی، قبلۂ اول کو منہدم کرنے کی اسرائیلی سازشوں، فلسطین کو اسرائیلی تسلط میں دینے والے اہم معاہدوں، اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کی دہشت گردانہ سرگرمیوں اور فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ متعدد مضامین میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں سرگرم مختلف تحریکوں، تنظیموں اور اداروں (الاخوان المسلمون، حماس، انتفاضہ، فتح، ندوۃ العلماء، جمعیۃ علماء ہند، جماعت اسلامی ہند) اور شخصیات (الحاج امین الحسینی، عزّ الدین قسّام، عبدالقادر حسینی، شیخ احمد یٰسین، یاسر عرفات، عبدالعزیز رنتیسی، مشہور ضامن، ابوالحسن علی ندوی) کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مضمون میں نقشوں کی مدد سے اور دوسرے مضمون میں جدول کی شکل میں مختلف ادوار میں فلسطین میں یہودیوں کی بڑھتی آبادی کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ایک مضمون میں فلسطینی کاز کو فائدہ پہنچانے والے مجلّات اور ویب سائٹس اور دوسرے مضمون میں فلسطین پر اہم تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔

الغرض اس خصوصی شمارہ کو ہر اعتبار سے جامع اور ہمہ جہت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح اسے فلسطین کے موضوع پر دستاویزی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ فاضل مدیر اور ان کے معاونین اس اہم علمی خدمت پر پوری امت اور بالخصوص فلسطینی کاز سے دل چسپی رکھنے والوں کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ امید ہے، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اسے قبول عام حاصل ہوگا۔ (م- ر)

آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

ملنے کا پتا: اولڈ کیمیو مشین فیکٹری، محلّہ لال مسجد، رام پور، یوپی، ۲۰۰۹ء، صفحات: ۵۲۷، قیمت -/۵۰۰ روپے

عربی زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ہے اور عرب و ہند کے مابین تعلقات زمانۂ قدیم سے قائم ہیں۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے طویل عرصہ تک حکومت کی ہے۔ تاریخ کے ان تمام ادوار میں بے شمار علماء وادبا گذرے ہیں، جنھوں نے عربی زبان و ادب کی، مختلف زاویوں سے خدمات انجام دی ہیں اور سرزمین ہند کو مختلف علوم وفنون سے موّ رکیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان خدمات کے جائزہ پر مشتمل ہے جو آزادی کے بعد عربی زبان وادب سے متعلق یہاں کے علماء وفضلاء نے انجام دی ہیں۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'عربوں کی ہندوستان آمد۔ تہذیبی اور تمدنی اختلاط' کے عنوان سے ہے۔ دوسرے باب (عہد مغلیہ ۱۵۲۵- ۱۷۰۷ء) میں اس دور کے چند اہم عربی ادبا وفضلاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ہے: 'انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوستان میں عربی زبان وادب'۔ اس دور کے حوالے سے بھی چند مشہور ادبا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں 'بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں عربی زبان وادب' کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب، جو کتاب کا اصل موضوع ہے، اس میں 'آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب' کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ایک سو پچھتر علماء وفضلاء کے تذکرے ہیں، جنھوں نے کسی نہ کسی پہلو سے عربی زبان وادب کی خدمت انجام دی ہے۔ آخر میں 'حاصل مطالعہ' کے عنوان سے پوری کتاب کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ شخصیات کے تذکرے کے ساتھ علمی سلسلوں کے عنوان سے دینی مدارس، عربی مجلّات، عربی ناشرینِ کتب یا ایسے اداروں کا ذکر کیا گیا جو خاص طور سے عربی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔ اس طرح یہ کتاب عربی زبان وادب کے سلسلے میں ہندوستانی علماء کی خدمات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ کتاب فاضل مصنف کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ یہ کام انھوں نے پروفیسر شاہ عبدالسلام کی نگرانی

میں انجام دیا ہے۔ اس کی اشاعت فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے ہوئی ہے۔

کتاب میں اگرچہ تمام قابلِ ذکر علماء، ادبا اور فضلاء کے تذکروں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر پھر بھی بہت سے مشہور فضلاء و ادباء کا نام آنے سے رہ گیا ہے، جیسے علامہ عبید اللہ رحمانی مبارک پوریؒ صاحب مرعاۃ المفاتیح، مولانا صفی الرحمان مبارک پوریؒ صاحب الرحیق المختوم، مولانا مختار احمد ندوی اور مولانا عبد العلی ازہری مئوی، جن کی عربی زبان وادب میں بیش قیمت خدمات ہیں۔ اسی طرح ناشرین کتب عربی میں الدار السّلفیہ ممبئی اور مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی کا ذکر آنے سے رہ گیا ہے۔ الدار السّلفیہ نے ۵۰ عربی کتب اور تقریباً ڈیڑھ سو عربی کتب کے ترجمے شائع کیے ہیں اور مرکزی مکتبہ اسلامی نے بھی متعدد وقیع عربی کتب کے ترجمے شائع کیے ہیں۔

مصنف نے زندہ شخصیات کے علمی کاموں کے تذکرہ میں ڈاکٹر حبیب اللہ خاں کی عربی تصنیف **الترجمة العربية في الهند بعد الاستقلال** سے کافی استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایک دہائی سے زائد عرصہ میں ان شخصیات نے جو علمی کام کیے ہیں ان کا مصنف نے کچھ بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔ متعدد اصحاب علم، جن کی وفات گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں ہوگئی تھی، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء)، مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء)، مولانا عبد السلام ندوی (م ۱۹۵۶ء)، مولانا اعزاز علی امروہوی (م ۱۹۵۴ء)، مولانا حسین احمد مدنی (م ۱۹۵۷ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) وغیرہ، ان کا سارا علمی کام آزادی سے پہلے کا ہے، لیکن مصنف نے ان کا تذکرہ 'آزاد ہندوستان میں عربی زبان وادب' کے ذیل میں کیا ہے، بلکہ غلطی سے آزادیٔ ملک سے قبل یا اس کے فوراً بعد وفات پا جانے والی بعض شخصیات مثلاً مولانا عبد اللہ عمادی (م ۱۹۴۶ء) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (م ۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ء) کا تذکرہ بھی اسی باب میں کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب افادیت کی حامل اور قابلِ مطالعہ ہے، خصوصاً نوجوان نسل کے لیے گائڈ بک کی حیثیت رکھتی ہے۔ (محمد جرجیس کریمی)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۳۸)

☆ ۴ تا ۷؍نومبر ۲۰۱۰ء مرکز جماعت اسلامی ہند کے کمپلکس، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیونئ دہلی میں جماعت کا کل ہند اجتماعِ ارکان منعقد ہوا۔ صدر ادارۂ تحقیق و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری نے اس کے افتتاحی سیشن کی صدارت فرمائی اور 'ہندوستانی سماج اور تحریک اسلامی ہند' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے موجودہ دور کے اجتماعی اور سیاسی نظام کی کم زوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے پورے اعتماد سے فرمایا کہ ہم اسلام کو موجودہ نظام حیات کے متبادل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں ۔ دوران اجتماع مسئلۂ فلسطین پر ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا، جس کا انھوں نے افتتاح فرمایا۔ اس کے علاوہ اختتامی سیشن میں انھوں نے بہ طور زاد راہ موثر خطاب فرمایا، جس میں ارکان جماعت کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں اور انھیں سماج میں موثر کردار ادا کرنے پر ابھارا۔ ۷؍نومبر کو 'ملک بچاؤ، غریبی، غلامی اور بدامنی سے' کے عنوان پر ایک جلسۂ عام منعقد ہوا، جس میں مختلف ملّی تنظیموں کے سربراہان نے خطاب کیا۔ امیر جماعت نے اس کی صدارت فرمائی۔

☆ 'عورت اور اسلام' مولانا عمری کی معروف اور مقبول کتابوں میں سے ہے۔ اس میں خواتین کے مقام و مرتبہ اور ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے انھیں حاصل حقوق بیان کیے گئے ہیں اور تاریخ و سیرت کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان عورت نے دین و اخلاق، تہذیب و معاشرت اور سیاسی عمل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی، ہندی اور گجراتی زبانوں میں پہلے ہوگیا تھا۔ اب تمل ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔

☆ ادارۂ تحقیق نے جماعت اسلامی ہند اے ایم یو ایریا کے اشتراک سے ایک سمپوزیم بعنوان 'بابری مسجد سے متعلق الٰہ آباد ہائی کورٹ کا حالیہ فیصلہ اور مسلمانان ہند' اپنے آڈیٹوریم میں ۳۱؍اکتوبر ۲۰۱۰ء کو منعقد کیا۔ اس کی صدارت پروفیسر اثمر بیگ، شعبۂ سیاسیات، اے ایم یو علی گڑھ نے کی اور شعبۂ سماجیات کے استاد اور مرکز برائے فروغ

تعلیم وثقافت مسلمانان ہند، اے ایم یو کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالوحید، شعبۂ کیمیکل انجینئرنگ کے صدر پروفیسر محمد ادریس، شعبۂ سیاسیات کے ڈاکٹر آفتاب عالم اور شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ڈاکٹر عبدالمجید خاں نے مقررین کی حیثیت سے شرکت کی۔ بعد میں یونی ورسٹی کے دیگر شعبوں کے متعدد اساتذہ اور طلبہ نے سوالات یا تبصروں کے ذریعہ مذاکرہ میں حصہ لیا۔

☆ ۹-۱۰/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو مشہور علمی وتحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں 'مصادر سیرت' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی اور 'ابن نفیس کا رسالۂ کاملیہ: تعارف وتجزیہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

ایک دوسرا سیمینار ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ کے زیر اہتمام ۶-۷/نومبر ۲۰۱۰ء کو 'معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ندوی نے اس میں بھی شرکت کی اور 'اسلامی نظامِ وراثت میں عورت کا حصہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

☆ ادارہ کے زیر تربیت اور بعض ہم خیال اداروں کے اسکالرس پر مشتمل ایک مجلس 'رائٹرس فورم' کے نام سے قائم ہے۔ اس کے تحت ۷/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو ادارہ کے اسکالر جناب مزمل کریم فلاحی قاسمی نے 'بچے اور اسلام' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

☆ جماعت اسلامی ہند کے کل ہند اجتماع ارکان کے موقع پر مجلّہ تحقیقات اسلامی کا اسٹال لگایا گیا، جس سے شرکائے اجتماع کی بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔ انھوں نے مجلّہ کے قدیم شمارے اور ارکان ادارہ کی تصنیف کردہ کتابیں خریدیں، آئندہ کے لیے مجلّہ کا اجراء کرایا اور اس کے سو شماروں (جنوری ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۲۰۰۶ء) پر مشتمل سی ڈی حاصل کی۔ (شائقین کو یہ سی ڈی اب بھی سو روپے بھیجنے پر فراہم کی جاسکتی ہے)۔

☆ ادارہ میں جاری تعمیراتی سرگرمیاں ان شاء اللہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اس سلسلے میں جن اصحاب خیر نے تعاون کیا ہے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔ پورے منصوبے کی تکمیل میں اب تھوڑی سی رقم مزید درکار ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی فراہم کرنے کے اسباب ہموار کردے۔ آمین!